www.shibliacademy.org

معارف

ستمبر ۲۰۱۸ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

www.shibliacademy.org

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپے۔ فی شمارہ ۲۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری / منیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

www.shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۲ ماہ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۱۸ء عدد ۳

مجلس ادارت

مولانا سید محمد رابع ندوی
لکھنؤ

پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی
علی گڑھ

(مرتبہ)
اشتیاق احمد ظلی
محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات — ۱۶۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات

ندوۃ العلماء اور ریاست بہاول پور — ۱۶۵
ڈاکٹر عصمت درانی

اسلامی شریعت اور دھرم شاستروں کا تقابلی جائزہ — ۱۷۶
ڈاکٹر محمد احمد نعیمی

خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور تاریخ اور کارنامے — ۱۹۲
ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن

شاد عظیم آبادی کی شعری خصوصیات — ۲۱۰
ڈاکٹر محمد زبیر

اخبار علمیہ — ۲۱۷
ک، ص اصلاحی

آثار علمیہ و تاریخیہ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک عربی مکتوب — ۲۲۰
مولوی طلحہ نعمت ندوی

معارف کی ڈاک

غیر مسلم مصنفین اور سیرت نبویؐ — ۲۲۲
ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا

وفیات

پروفیسر فواد سزگین — ۲۲۳
اشتیاق احمد ظلی

مولانا عبداللہ کاپودروی مرحوم — ۲۳۴
ع۔ص

ادبیات

غزلیں — ۲۳۷
پروفیسر سید امتیاز احمد ماہر علیگ
جناب جمیل مانوی

مطبوعات جدیدہ — ۲۳۹
ع۔ص

رسید کتب — ۲۴۰

www.shibliacademy.org

شذرات

آسام میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ باہر سے آکر یہاں آباد ہونے والوں میں بیشتر کا تعلق پڑوسی علاقہ بنگال سے ہے۔ مختلف اسباب کے تحت بنگال سے نقلِ مکانی کرکے آسام میں آباد ہونے کا سلسلہ صدیوں سے جاری رہا ہے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں اس میں بہت اضافہ ہوا۔ آسام کی زمین چاء کی کاشت کے لیے موزوں تھی لیکن آسام میں اس کام کے لیے مطلوبہ تعداد میں مزدور دستیاب نہیں تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بنگال سے بڑی تعداد میں مزدوروں کو لانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح آسام میں آباد ہونے والے مزدوروں کی تعداد وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ آزادی سے پہلے بنگال سے آسام منتقل ہونے والوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں اس کا خاص طور پر تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ مردم شماری کے سپرنٹنڈنٹ کے مطابق گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں آسام میں ظہور پذیر ہونے والا یہ سب سے اہم واقعہ تھا اور اس کے نتیجہ میں آسام میں آبادی کا تناسب ہمیشہ کے لیے بدل جائے گا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ آسام میں موجود بنگالیوں کی غالب اکثریت آزادی اور ملک کی تقسیم سے پہلے وہاں آباد ہو چکی تھی۔ اس امکان سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے قیام کے وقت کسی قدر نقلِ مکانی عمل میں آئی ہو لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ماضی قریب میں بنگالی مسلمانوں کی کوئی بڑی تعداد بنگلہ دیش سے آسام میں داخل ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہاں آباد بنگالی مسلمانوں کی غالب اکثریت ان تارکین وطن کی اولاد ہیں جو انگریزوں کے دور اقتدار میں مزدوروں کی حیثیت سے لائے گئے یا یہاں آکر آباد ہوگئے۔ ماضی قریب میں اگر بنگلہ دیش سے نقلِ مکانی کے واقعات ہوئے بھی ہیں تو وہ ناقابل لحاظ حد تک کم ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد بڑے زور وشور سے یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ آسام کو مشرقی پاکستان سے دراندازی کرکے یہاں آنے والوں سے بڑا خطرہ لاحق ہے اور اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ اس سے اس علاقہ کا کلچر ہی بدل جائے۔ اس کی وجہ سے ۱۹۵۱ء میں پہلا نیشنل رجسٹر آف سٹی زنس (NRC) تیار کیا گیا۔ یہ ملک کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا رجسٹر تھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پھر اس مسئلہ نے سر اٹھایا اور کہا گیا کہ وہاں سے بڑے پیمانے پر آسام میں نقلِ مکانی کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اس مزعومہ دراندازی کے خلاف ۱۹۷۰ء کی دہائی میں آل آسام اسٹوڈنٹس یونین (AASU) نے ایک پُرزور تحریک چلائی جو بعد میں تشدد کی راہ پر چل پڑی۔ فروری ۱۹۸۳ء میں نلّی کا خوں ریز تصادم اسی کا نتیجہ تھا۔ اس میں تین ہزار بے گناہ مسلمان مارے گئے۔ آج تک اس میں ملوث کسی شخص کے خلاف نہ کوئی فرد

www.shibliacademy.org

جرم عاید کی گئی اور نہ کسی کو کوئی سزا ہوئی۔ اس ماحول میں ۱۹۸۵ء میں راجیو گاندھی کی زیر قیادت مرکزی حکومت اور آل آسام اسٹوڈنٹس یونین اور اس نوع کے دوسرے گروہوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کو آسام اکارڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ۲۴/مارچ ۱۹۷۱ء کو نقلِ مکانی کے سلسلہ میں حدِ فاصل کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ جو لوگ اس تاریخ سے پہلے آسام میں اپنی موجودگی ثابت نہیں کرسکیں گے ان کو دراندازاور غیر ملکی قرار دے دیا جائے گا۔ اس معاہدہ کی شقوں کی روشنی میں ۱۹۵۱ء کے نیشنل رجسٹر کو اپڈیٹ کیا جانا تھا لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ ۲۰۰۹ء میں ایک شخص نے اس سلسلہ میں سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ ۳۱/جنوری ۲۰۱۶ء تک اس کام کو مکمل کرلیا جائے اور یہ کہ یہ کام عدالت عالیہ کی نگرانی میں انجام پائے گا۔ عدالت کے مقرر کیے ہوئے وقت پر تو اس کام کی تکمیل نہیں ہوسکی البتہ دسمبر ۲۰۱۷ء میں اس کا پہلا ڈرافٹ شائع کیا گیا اور اب ۳۰/جولائی کو اس کا فائنل ڈرافٹ بھی شائع کردیا گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں آسام کے مسلمانوں کو ایک بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہے۔ آسام کی کل آبادی 9.32 ملین ہے۔ اس ڈرافٹ میں ان میں سے چار ملین یعنی چالیس لاکھ لوگوں کے نام موجود نہیں ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کی غالب اکثریت غریب اور نادار مسلمانوں کی ہے۔ ان میں سے ایک لاکھ پچیس ہزار لوگ ایسے ہیں جن کا نام پہلی لسٹ میں موجود تھا لیکن دوسری لسٹ سے غائب ہے۔

این آر سی کے فائنل ڈرافٹ کی اشاعت کے بعد آسام میں جو صورت پیدا ہوئی ہے وہ بے حد سنگین ہے۔ چالیس لاکھ انسانوں کا مستقبل سخت خطرات کی زد میں ہے۔ انجام کار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی حسّاس دستاویز کی تیاری میں جس غیر معمولی احتیاط کی ضرورت تھی اس کا اہتمام نہیں کیا جاسکا جس کی وجہ سے بڑی عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی خاندان کے بعض افراد کے نام اس ڈرافٹ میں موجود ہیں جبکہ بعض دوسرے افراد کے نام غائب ہیں۔ ناموں میں املا کی معمولی غلطیوں کی وجہ سے بہت سے ریکارڈ مسترد کردیے گئے ہیں۔ سرکاری رکارڈس میں مسلمانوں کے نام میں املا کی جیسی غلطیاں ہوتی ہیں اس سے ہم سب واقف ہیں۔ ابھی گورنمنٹ صرف اتنا ہی کہہ رہی ہے کہ جن لوگوں کے نام کو فائنل ڈرافٹ میں جگہ نہیں مل سکی ہے ان کو اپنے استحقاق کو ثابت کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اس کام کے لیے دستیاب تین مہینوں کی مختصر مدت میں عملاً ممکن بھی ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس وقت اس منصوبہ پر ۱۰۰ مراکز کام کررہے ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس مدت میں وہ یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔ حکمراں جماعت شروع ہی سے یہ کہتی آرہی ہے کہ جو مسلمان اپنی شہریت ثابت نہیں کرسکیں گے ان کو غیر ملکی قرار دے کر ملک بدر کردیا جائے گا۔

www.shibliacademy.org

البتہ ہندوؤں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ یاد رہے کہ بنگلہ دیش کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ بنگلہ دیش اس طرح کے کسی ایک آدمی کو بھی قبول نہیں کرے گا۔ کیا روہنگیا کی طرح ہندوستان میں بھی بے وطن لوگوں کا ایک طبقہ وجود میں آئے گا جو رہے گا تو اس سرزمین پر لیکن شہریت کے حقوق سے محروم ہوگا۔ کیا ان کو نظر بندی کیمپ میں رکھا جائے گا۔ آسام میں اس وقت چھ ایسے نظر بندی کیمپ ہیں جہاں ایک ہزار ایسے لوگوں کو رکھا گیا ہے جن کو غیر ملکی قرار دیا جا چکا ہے۔ ان کو ایسے حالات میں رکھا جا رہا ہے جن سے بین الاقوامی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ حکومت کے ارادوں کا کسی حد تک اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح کے مزید مراکز کھولنے کی خواہش مند ہے۔ یہ واضح ہے کہ حکومت کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ اسے مختلف طبقات کے درمیان منافرت کے جذبات ابھارنے اور اسے ووٹ کی سیاست کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔

جن لوگوں کے نام فائنل ڈرافٹ میں نہیں آسکے ہیں ان کے لیے ضروری دستاویزوں کا حصول آسان نہیں ہے۔ کرپٹ اور متعصب مقامی انتظامیہ سے اس سلسلہ میں کسی تعاون کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ فارنرز ٹریبونل جن کا کام ثبوت میں پیش کیے جانے والے کاغذات کو چک کرنا ہے، ان میں سے دو تہائی موجودہ حکمراں جماعت کے ذریعہ قائم کیے گئے ہیں۔ ان مراکز کو عدلیہ کے مستقل اور آزاد ارکان نہیں چلاتے بلکہ ان کی اکثریت ان مقامی وکلاء پر مشتمل ہے جن کی خدمات کو وقتی طور پر حاصل کیا گیا ہے۔ یہ وکلاء مقامی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کے جذبات اور احساسات کو جاننے کے لیے بہت زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود مسلمانوں سے نفرت وعداوت کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ جہالت اور غربت کی وجہ سے ایک طرف تو بہت سے لوگوں کو ان رکارڈس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہی نہیں تھا چنانچہ ان کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جا سکا۔ وہ اپنے بچوں کا نہ تو رجسٹریشن کراتے ہیں اور نہ ان کو اسکول بھیجتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے رکارڈس بار بار آنے والے سیلابوں کی نذر ہو گئے۔ خواتین کے سلسلہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ اکثر ان کی شادی اس عمر کو پہنچنے سے پہلے ہو جاتی ہے جب ان کو ووٹنگ کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح ووٹنگ لسٹ میں ان کا نام والد کے نام کے ساتھ نہیں آتا۔ شوہر کے نام کے ساتھ ان کا نام درج ہو تو بھی وہ قانون کی نگاہ میں قابل قبول نہیں ہے۔ اس وقت آسام کا مسلم معاشرہ ایک بہت بڑے انسانی المیہ سے دوچار ہے اور صورت حال حد درجہ دردناک ہے۔ اگر حالات کا رخ نہ بدلا تو یہ سلسلہ آسام سے باہر بھی شروع ہوگا۔ اس سلسلہ میں بنگال کا نام تو آ ہی رہا ہے۔ آسام میں خاص طور سے اس وقت بہت بیدار مغزی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جو تنظیمیں اس وقت وہاں کام کر رہی ہیں وہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون وقت کی ضرورت ہے۔ باہمی تعاون اور اشتراک کے ذریعہ ہی اس مصیبت سے نمٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

www.shibliacademy.org

مقالات

ندوۃ العلماء اور ریاست بہاول پور

ڈاکٹر عصمت درانی

(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں نصاب اور عملہ کی ازسرنو تنظیم کے لیے ریاست کے وزیر تعلیم کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس میں مولانا ظفر انصاری (۱۹۰۸-۱۹۹۱ء)، مولانا محمد شفیع (۱۸۸۳-۱۹۶۳ء)، سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور اور چند دیگر علمائے کرام بھی شامل تھے۔ نصاب میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی تربیت کو بھی شامل کیا گیا۔ جامعہ کے امتحانات کو پنجاب یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے مقابل درجہ پر لانے کا اہتمام کیا گیا۔ کیونکہ پنجاب یونیورسٹی میں علامہ کی کلاسز نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے طے پایا کہ جامعہ میں اس جماعت کی سندات حسب سابق دی جاتی رہیں گی۔ ان سفارشات کو قطعی شکل کراچی میں ۱۳/جولائی ۱۹۵۲ء کو سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد ہونے والے اجلاس میں دی گئی۔ ان تجاویز کے مطابق جامعہ میں تعلیم کے درج ذیل چھ درجات مقرر ہوئے: ورود، رشد، عبور، فوض، مہارت، تحقیق۔ (گورنمنٹ گزٹ، ۱۷/جولائی، ۱۹۵۲ء، ص ۵)

مولانا سید سلیمان ندوی کے مکتوبات میں بھی متعدد مقامات پر بہاول پور کا ذکر ملتا ہے اور اس ریاست کے عمائد سے ان کے تعلق کا علم ہوتا ہے، مثلاً ریاست بہاول پور کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین، جو مولانا غلام حسین کے صاحبزادے تھے اور اپنی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے باعث بہاول پور کی ممتاز شخصیات میں سے تھے، سے سلیمان ندوی کے تعلق خاطر اور مراسلت کا علم ان مکتوبات سے ہوتا ہے، جو انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷ء) کے نام لکھے۔ مثلاً نیاز فتح پوری (۱۸۸۴-۱۹۶۶ء) نے اپنے رسالہ نگار (اجرا فروری ۱۹۲۲ء)، جسے عقلیت پسندوں اور آزاد خیالوں

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

www.shibliacademy.org

کا ترجمان رسالہ کہا جاتا تھا، میں مذہب کے خلاف تحریریں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور ایک استفسار کے جواب میں کلام مجید کے الہامی ہونے سے انکار کر دیا۔ نگار کے کئی شماروں میں اس کی مخالفت و موافقت اور اعتراضات و جوابات کا سلسلہ چلتا رہا۔ مذہبی جوش کے تحت سید سلیمان ندوی نے بھی معارف اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء کے شماروں میں اس کا مدلل جواب دیا (معین الدین ندوی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۸۸) لیکن جب نگار کی بہاول پور جیسی اسلامی ریاست سے اشاعت کی افواہیں پھیلیں تو انہیں بجا طور پر تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ ۷ر جولائی ۱۹۴۰ء کو عبدالماجد دریابادی کے نام لکھا:

''بھوپال اور بہاول پور میں اس (نگار) کی اشاعت کا دعویٰ غلط سا معلوم ہوتا ہے۔ بہاول پور میں تو اور بھی غلط ہے۔ بہرحال، میں وزیر صاحب تعلیم بہاول پور کی خدمت میں لکھتا ہوں، نیک اور مذہبی آدمی ہیں''۔ (سلیمان ندوی، ۱۹۸۶ (حصہ دوم)، ص ۹۱)

اگلے مکتوب مرقومہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۰ء میں انہوں نے عبدالماجد دریابادی کو نگار کی خریداری حیدرآباد کے سرکاری اداروں اور درس گاہوں میں بند ہونے کی خبر دیتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا ہے:

''بہاول پور کی بات غلط نکلی، وہاں اسے کوئی جانتا بھی نہیں''۔ (سلیمان ندوی، ۱۹۸۶ (حصہ دوم)، ص ۹۲)

۷ر جولائی ۱۹۴۰ء کو عبدالماجد دریابادی کے مجلہ صدق (اجرا مئی ۱۹۳۵ء) میں نگار کے ان مندرجات کے متعلق مضامین شائع ہوئے، جن کے مطالعہ کے بعد انہوں نے عبدالماجد دریابادی کو لکھا:

''صدق کے یہ نمبر اس پتا پر بھجوا دیجیے:

۱۔ عالی مرتبت میجر شمس الدین محمد صاحب، وزیر تعلیم، بہاول پور۔

۲۔ جناب بقا محمد خان صاحب، چیف انسپکٹر تعلیم، بہاول پور۔ ۳۔ مولانا عبداللہ صاحب، مدیر مراسلات تعلیمی، بہاول پور''۔ (سلیمان ندوی، ۱۹۸۶ء، حصہ دوم، ص ۹۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کیا، جس کے ابتدائی مسودے کے کچھ نسخے سید مرتضیٰ علی دہلوی نے اپنے خرچ پر پارۂ اول نام سے شملہ سے طبع کروا دیے۔ جس کے درمیان ایک ایک سادہ ورق لگا کر مختلف احباب کے پاس اصلاح و مشورہ اور رائے زنی کے لیے بھیجا

www.shibliacademy.org

گیا(عبدالماجد دریابادی،۱۹۹۶ء،ص ۲۹۴)۔مولانا عبدالماجد نے سید سلیمان ندوی کو خط میں اس تفسیر کو حیدرآباد اور بھوپال کے رئیسوں کے علاوہ بہاول پور کے علم دوست احباب تک پہنچانے کو بھی کہا تا کہ اس کی سرپرستی سے اشاعت خوب ہو اور کتاب، کتب خانوں تک پہنچے۔(سلیمان ندوی،۱۹۸۶ء، حصہ دوم،ص ۱۳۰)اس کے جواب میں سید سلیمان ندوی نے ۱۳؍مئی ۱۹۴۳ء کو لکھا:

"پارۂ اول کی جو کاپیاں آئیں گی انشاء اللہ مناسب مقامات پر بھیج دی جائیں گی۔مثلاً نواب مہدی یار جنگ بہادر، حیدرآباد، شعیب صاحب، دبیر الانشاء قاضی ولی محمد صاحب، سر لیاقت علی صاحب بھوپال، جسٹس سر عبدالقادر صاحب بہاول پور(۱۰)، بہاول پور کے وزیر تعلیم (میجر شمس الدین) کو ابھی خط میں لکھ دیا"۔

(سلیمان ندوی،۱۹۸۶ء،حصہ دوم،ص:۱۳۲)

میجر شمس الدین کے سلیمان ندوی کے نام خطوط مآخذ میں دستیاب نہیں ہیں لیکن ریاست بہاول پور کے سول جج مولوی فضل محمد المعروف فضل اللہ فاروقی (۱۱)،(۱۹۱۸۔۲۶؍جولائی ۱۹۸۳ء) کے نام ان کا ایک خط ملتا ہے(۱۲) جو تبرکاً یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دفتر مجلس نظام اسلامی
شبلی منزل،اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔خوشی ہوئی کہ آپ کو نظام اسلامی کی تحریک سے دلچسپی ہے۔ابھی تک اس کے متعلق کوئی خاص لٹریچر نہیں چھپا ہے۔سب قلمی تحریریں ہیں۔جب کوئی چیز چھپے گی تو مرسل ہوگی۔

والسلام
سید سلیمان
۱۲؍مارچ ۱۹۴۱ء

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دوسرے فرزند، جنہوں نے ریاست کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں، مولانا محمد ناظم ندوی ہیں۔دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل مولانا محمد ناظم ندوی، مادر علمی میں دس برس تدریسی وانتظامی خدمات انجام دینے کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے

www.shibliacademy.org

پاکستان مقیم ہوئے تو سید سلیمان ندوی کے ایما پر دسمبر ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ کے شیخ الجامعہ کے عہدے پر منتخب ہوئے۔ وہ کشاف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ (رحمت، عبدالرشید، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۸)۔ مولانا کی سربراہی کا دور جامعہ عباسیہ کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے، جس میں علمی و ادبی سرگرمیوں کو خوب فروغ حاصل ہوا، وہ چوتھے شیخ الجامعہ تھے، ان کے دور میں ہی ۱۹۵۰ء میں جامعہ عباسیہ کی عمارت (موجودہ عباسیہ کیمپس، جو Old Campus کے نام سے معروف ہے) کی تعمیر مکمل ہوئی۔ جامعہ کے مرکزی ہال کے باہر موجود "غلام محمد گھوٹوی ہال" کی مرمرین تختی جو ۱۹۵۲ء میں مولانا ناظم ندوی نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی، آج تک موجود ہے (شبلی، نصیر الدین، ص ۱۶۸)۔ اسی دور میں ۹/اکتوبر ۱۹۵۹ء کو بہاول پور میں اردو اکیڈمی (۱۳) کی بنیاد رکھی گئی، جس کی افتتاحی تقریب جامعہ عباسیہ میں منعقد ہوئی۔ مولانا نے جامعہ میں اردو اکیڈمی کے لیے فرنیچر اور عملہ سمیت ایک کمرہ مختص کر دیا اور یوں اس اکیڈمی کے کام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وہ اردو اکیڈمی کی پہلی مجلس انتظامیہ و عاملہ کے رکن تھے اور بعد ازاں معتمد عمومی بھی رہے۔ انہوں نے اکیڈمی کی یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دی۔ (سید عارف علی، ص ۱۲)

مولانا محمد ناظم ندوی نومبر ۱۹۶۱ء کو دو سال کی رخصت پر جامعہ اسلامیہ مدینہ تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو جامعہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ صدر ایوب خان نے اکتوبر ۱۹۶۳ء میں "جامعہ اسلامیہ" کے نام سے اس کا افتتاح کر کے ایک آرڈیننس کے ذریعے اس کا انتظام و انصرام اوقاف کے سپرد کیا اور شیخ الجامعہ کا عہدہ ختم کر دیا گیا، ان کو شعبۂ عربی کی سربراہی پیش کی گئی لیکن وہ جس ادارے میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کر چکے تھے، وہاں صدر شعبہ بننا گوارا نہ کیا (محمد صادق، ص ۱۱۴)۔ مولانا نے ۱۹۶۹ء تک بہاول پور ہی میں بحیثیت ناظم امور دینیہ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں بہاول پور سے کراچی منتقل ہوئے جہاں ۹ جون ۲۰۰۰ء کو انتقال کیا۔ (راشد شیخ، ص ۱، https://fridayspecial.com.pk)

مولانا محمد ناظم ندوی نے اپنے ایک مضمون "بہاول پور کی یادیں" میں یہاں اٹھارہ سالہ قیام کی یادوں کو دہرایا ہے:

> "گو کہ مجھے بہاول پور چھوڑے ہوئے ایک جگ بیت گیا ہے، مگر اس کی یاد دل میں روز ازل کی طرح تازہ ہے۔ بہاول پور کے ساتھ میری بہت سی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں اور اب تو یہ یاد دائمی صورت اختیار کر گئی ہے..... اس دینی اور علم پرور

www.shibliacademy.org

سرزمین کا ذکر میں نے ابتدائی علمی زندگی میں اس وقت سنا تھا جب آج سے ۵۴ سال قبل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں تھا۔ اس خطہ کے عباسی فرماں روا کی علم دوستی، ہندوستان کے دانش کدوں اور علما کے ساتھ اس حکمراں خاندان کے قدیم تعلق کی باتیں سنی تھیں۔ دارالعلوم ندوہ کی وسیع وشاندار محرابوں والی دومنزلہ قدیم عمارت جو مغل طرز تعمیر کی عکاسی کرتی ہے، اس کی تعمیر میں امیر بہاول پور صادق محمد خان عباسی مرحوم کی والدہ نے بڑا حصہ لیا تھا''۔ (ناظم ندوی، ص ۵۶)۔

ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل معروف مصنف، محقق، محدث جامع معقول ومنقول مولانا عبدالرشید نعمانی (۱۹۱۵-۱۹۹۹ء) اسی ادارے کے نامور محدث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی (۱۸۶۴-۱۹۴۲ء) کے خاص شاگرد تھے۔ بقول بلال عبدالحی حسنی ندوی، انہوں نے مولانا کی ذات وصفات اور زاہدانہ زندگی کو اس طرح اپنے اندر جذب کرلیا کہ مولانا کے مثنی بن گئے (عبدالرشید نعمانی، ص ۹)۔ مولانا حیدر حسن نے بھی ان پر خصوصی شفقت فرمائی اور ان کے جوہر کو جلا بخشی۔ عبدالرشید نعمانی، ندوۃ العلماء کے رفیق بھی تھے اور ''مجلس احیاء المعارف النعمانیہ'' حیدرآباد دکن کے رکن رکین بھی۔ ۱۹۸۸ء میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا ضیاء الحسن کی اچانک وفات کے بعد مولانا عبدالرشید ندوی کی درخواست پر ندوہ تشریف لائے اور تین ماہ تک باقاعدہ بخاری شریف کی تدریس کی ذمہ داری نبھائی۔ لیکن اس کے بعد بھی متعدد طلبہ واساتذہ مراسلت کے ذریعے ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۹۹۱ء میں مولانا پھر ہندوستان تشریف لائے اور دارالعلوم میں قیام کے دوران شرح نخبہ کا درس دیتے رہے۔ ان کی مشہور تصانیف میں لغات القرآن (تین جلدیں)، المدخل فی اصول حدیث، ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ، ابن ماجہ اور علم حدیث (اردو ترجمہ)، مکانۃ ابی حنیفہ فی علم الحدیث اور متعدد رسائل، مثلاً یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں، شہدائے کربلا پر افترا، اکابر صحابہ پر بہتان، ناصبیت، تحقیق کے بھیس میں وغیرہ شامل ہیں (عبدالرشید نعمانی، ص ۹-۲۱)۔

عبدالرشید نعمانی پاکستان ہجرت کرنے کے بعد دارالعلوم اشرف آباد ٹنڈوالا یار اور مدرسہ عائشہ صدیقہ للبنات کراچی سے وابستہ رہے، ۱۹۶۳ء میں جامعہ عباسیہ، بہاول پور کے شعبۂ اسلامیات کے صدر مقرر ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور وزارت عظمی (۱۹۷۳-۱۹۷۷ء) میں جامعہ اسلامیہ کو محکمہ تعلیم

www.shibliacademy.org

کے حوالے کر دیا گیا۔ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی نے ۴/مارچ ۱۹۷۵ء میں اسلامیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دی (فرخ سلیم انصاری، ص ۲۲۴-۲۳۰)۔ یہاں مخلوط تعلیم کا چلن ہوا تو ۱۹۷۶ء میں اس ناپسندیدگی کے باعث یہ ملازمت ترک کر دی (مصاحبہ عبدالشہید نعمانی، بتاریخ ۵، ۶/اپریل ۲۰۱۸ء)۔

ندوۃ العلماء کے ایک اور فرزند مولانا عبدالرشید شیخ سہسرامی (۱۹۲۲ء) دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور اورینٹل کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ عباسیہ بہاول پور میں بطور مدرس تعینات ہوئے۔ بعد ازاں، جامعہ اسلامیہ اور اسلامیہ یونیورسٹی کے ادوار میں بھی شعبۂ عربی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رکھا۔ **المقالات العربیہ**، اور **اطریقہ السھلا فی العربیہ** قابل ذکر تصانیف ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں اسی شعبہ سے سبکدوش ہوئے۔ نیویارک میں وفات پائی اور بہاول پور میں تدفین ہوئی۔ (محمد صادق، ص ۱۴۲)۔

(۳)

ندوۃ العلماء کے دیرینہ خدمت گار مولانا حبیب الرحمان شروانی کے کتب خانہ گنج بخش میں موجود کلیات ابن یمین کے ایک نسخے کے مندرجات سے ان کے بہاول پور سے تعلق کا علم ہوتا ہے۔ یہ نسخہ نواب صادق محمد خان خامس کے ''کتب خانۂ سلطانی'' میں موجود تھا۔ سلطنت آصفیہ دکن کے منتظم علوم نے بہاول پور میں اپنی آمد کے موقع پر کتب خانہ کا دورہ بھی کیا اور وہاں موجود کلیات ابن یمین کو دیکھا تو کہا کہ وہ مدت سے اس دیوان کی تلاش میں تھے۔ اب جا کر بہاول پور میں یہ نایاب نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ وہ اس دیوان کو عاریتاً اپنے ساتھ دکن لے گئے اور نقل کرا لینے کے بعد اصل دیوان واپس کیا تھا (عزیز، ستمبر، ۱۹۴۰ء، ص ۲۸)۔ کتب خانہ گنج بخش میں موجود یہ ضخیم نسخہ ۱۰۲۷ صفحات پر مشتمل ہے جس پر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی کئی یادداشتیں درج ہیں۔ صفحہ نمبر بعد میں پنسل سے لکھا گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۰۲۳ اور ۱۰۲۴ بیاض الاصل ہیں۔ صفحہ ۱۰۲۳ پر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی سب سے پہلی یادداشت ۲۲/صفر المظفر ۱۳۴۱ھ کی درج ہے جس میں انہوں نے اس نسخے کی مکمل کیفیت لکھی ہے:

> ''کلیات ابن یمین کا یہ نسخہ حیدرآباد دکن میں میری فرمائش سے لکھا گیا۔ منقول عنہ نسخہ نواب صاحب بہاول پور کے خاص کتاب خانہ میں تھا۔ مولوی رشید احمد

www.shibliacademy.org

صاحب انصاری نے اس کا پتا لگایا۔ مولوی سر رحیم بخش صاحب کونسل کے پریسڈنٹ کی مہربانی سے نقل کے واسطے مجھ کو ملا، جزاھما اللہ عنی خیراً.....''۔ (عطا خورشید، ص ۲۵۰-۲۲۸)

۱۹۳۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وفد کے ممبران نے کتب خانۂ سلطانی کا دورہ کیا اور نواب صاحب کی علم دوستی اور انتخاب سے بہت متاثر ہوئے۔ مولوی محمد عبید الرحمان شروانی (۱۸۹۷-۱۹۹۲ء) بھی اس وفد میں شامل تھے۔ انہوں نے واپس جا کر اپنے والد حبیب الرحمان خان شروانی سے کتب خانہ سلطانی میں موجود معجم کبیر طبرانی کا ذکر کیا۔ جس پر انہوں نے عزیز الرحمان کو لکھا:

''معجم کبیر طبرانی کی کیفیت پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ایک نادر علمی سرمایہ ہے۔ کاش میں اس کی زیارت سے مشرف ہوتا''۔ (عزیز، اپریل ۱۹۴۰ء، ص ۴۱)

ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) متعدد علمی، ادبی و تاریخی مضامین و کتب کے مصنف تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ندوۃ العلماء سے بطور طالب علم وابستہ ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں اسی ادارے میں بحیثیت استاد عربی ادب اور تفسیر و حدیث، تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور اہم ترین عہدوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے سنبھالتے ناظم مقرر ہوئے اور تاحیات رہے (وحید الدین، مولانا، یکم جنوری ۲۰۱۷ء)۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) کے حکم پر ان کے شیخ و مرشد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری (۱۸۳۵-۱۹۳۶ء) سے بیعت کے لیے بہاول پور آئے۔ خلیفہ غلام محمد دین پوری اس عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ ان کا تعلق قادری سلسلہ سے تھا اور خان پور سے چند میل کے فاصلہ پر واقع قصبہ دین پور میں مقیم تھے (ابوالحسن ندوی، ص ۱۲۷)۔ ابوالحسن علی ندوی کا یہ پہلا سفر بہاول پور تھا، جو جون ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں انجام پایا اور تین چار دن قیام پر مشتمل تھا۔ بہاول پور کی ان یادوں کو دہراتے ہیں:

''۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خان پور کے لیے روانہ ہوا..... مغرب کو ہم لوگ خان پور پہنچے۔ وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً رات کو ہی مولانا کی زیارت ہوگئی۔ ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ نہایت کم گو اور کم سخن تھے۔ گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ

www.shibliacademy.org

ریاستی زبان میں جو ملتانی وسندھی کا مجموعہ ہے اور جس سے میں بالکل نا آشنا تھا، دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنوں میں دین پور تھا، قادری طریقے پر ذکر جہر سے مسجد و خانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی۔ اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی الا اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی الا اللہ سے ہی اس کا جواب دیتا..... یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں۔ آب وہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی۔ مقیمین خانقاہ کے لیے ایک لنگر تھا جس میں خالص سندھی اور بہاول پوری مزاج کا ایسا کھانا تیار ہوتا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لیے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا۔ گرمی شدت کی تھی، دن بھر لُو چلتی اور رات کسی قدر ٹھنڈی ہو جاتی''۔ (ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۲۹-۱۳۰)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا دوسرا سفر بہاول پور ۱۹۳۶ء میں خلیفہ صاحب کی وفات پر ایک شب کے لیے ہوا۔ بہاول پور کے تاریخی مآخذ کے مطابق ابوالحسن علی ندوی نے جامعہ عباسیہ کا دورہ بھی کیا (رحمت، عبدالرشید، ص ۲۱۶)۔ لیکن جامعہ کا ریکارڈ روم زیر آب آنے اور تمام ریکارڈ تلف ہونے کے باعث اس دورے کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ ان کی کتاب پرانے چراغ (حصہ اول) کے مندرجات سے علم ہوتا ہے کہ ان کا پہلا سفر پاکستان ۱۹۵۶ء میں ہوا (ابوالحسن ندوی، ص ۱۹۸)۔ ابوالحسن ندوی کے مولانا محمد ناظم ندوی سے بھی دوستانہ مراسم تھے، جو ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۳ء تک شیخ الجامعہ رہے، لہٰذا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ دورہ شاید ۱۹۵۶ء میں یا اس کے بعد کے کسی سال میں مولانا ناظم ندوی کے دور میں ہوا ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوبکر غزنوی (دور ۴ ستمبر ۱۹۷۵-۲۴/اپریل ۱۹۷۶ء)، جن کے والد مولانا داؤد غزنوی (۱۸۹۵-۱۹۶۳ء) بین الاقوامی شہرت کے حامل عالم دین تھے، سے بھی مولانا ابوالحسن ندوی کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب پرانے چراغ کے حصہ دوم میں ''مولانا سید ابوبکر غزنوی'' عنوان کے تحت ایک مضمون میں کیا ہے۔ (ندوی، ابوالحسن، ص ۳۴۳-۳۴۹)

گویا کہا جاسکتا ہے کہ خلافت عباسیہ کی عظیم علمی میراث کے امین فرماں روا کو اپنے خاندانی پس منظر کے ناطے اس مذہبی وعلمی سعادت کا ہمیشہ پاس رہا جس کا عملی مظاہرہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں ہمیشہ کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء نے

www.shibliacademy.org

مذہب اور ملک وقوم کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دینے کا جو عزم صمیم کیا تھا، اس کے اثرات وثمرات صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے، ہزاروں میل دور اس ریاست تک بھی پہنچے اور ہنوز موجود ہیں۔

حواشی

(۱۰) سر شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ـ۱۹۵۰ء)، ۲/مارچ ۱۹۴۲ء تا ۲/مارچ ۱۹۴۶ء صدر عدالت بہاول پور کے چیف جج رہے (محمد طاہر، ریاست بہاول پور کا نظم مملکت (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء)، ص ۷۷۔ (۱۱) مولوی فضل اللہ فاروقی (وفات ۲۶/جولائی ۱۹۸۳ء) بن مولوی فیض محمد (مجسٹریٹ ریاست بہاول پور)، ایم اے پولیٹیکل سائنس، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۳۹ء)، ایم اے عربی، گولڈ میڈلسٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایل ایل بی گولڈ میڈلسٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۴ء بہاول پور میں سول جج اور مجسٹریٹ رہے۔ ''الفیض'' نام سے ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، سرائیکی اور ہندی زبان میں کتب اور جرائد کی فائلیں موجود تھیں۔ مشاہیر سے مراسلت رکھتے تھے، جن میں سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) قابل ذکر ہیں۔ بہاول پور کے محلہ قاضیاں میں رہتے تھے۔ محمد حسن خان میرانی نوشاہی نے ان کی وفات کی تاریخ کا قطعہ لکھا۔ دیکھیے صحیفۂ تاریخ، مرتبہ محمد حسن خان میرانی، اردو اکیڈمی بہاول پور، ۱۹۸۴ء، ص ۶۴۔ (۱۲) یہ خط فضل اللہ فاروقی کے بھانجے کامران فاروقی، مقیم بہاول پور کے پاس محفوظ ہے۔ (۱۳) اردو اکیڈمی کی مفصل تاریخ اور مطبوعہ کتب کی تفصیل کے لیے اردو اکیڈمی کی جامع تاریخ اور کارکردگی۔ ایک جائزہ، سید محمد عارف، ۲۰۰۳ء، اردو اکیڈمی، بہاول پور۔

کتابیات

ابوالحسن علی حسنی ندوی (۲۰۱۰ء)، پرانے چراغ، (حصہ اول) مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ۔

ابوالحسن علی حسنی ندوی (۲۰۱۰ء)، پرانے چراغ مع تکملہ سینے کے داغ، طبع ششم، مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ۔

سلیمان ندوی (۱۹۲۸ء) مکاتیب شبلی (جلد اول ودوم)، باہتمام مسعود علی ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ۔

سلیمان ندوی (۱۹۴۵ء)، سفر افغانستان (تین ہم سفر، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود) نفیس اکیڈمی، حیدرآباد، دکن۔

www.shibliacademy.org

سلیمان ندوی (۱۹۸۶ء) سید سلیمان ندوی کے خطوط، عبدالماجد دریا بادی کے نام (جلد اول)، مرتبہ عبدالماجد دریابادی، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی۔

شبلی، نصیرالدین (۲۰۱۶ء)، شخصیت وافکار۔ شیخ الاسلام محدث گھوٹوی، حضرت شیخ الاسلام اکیڈمی، ملتان۔

شبلی نعمانی (۱۹۳۸ء)، زندہ زبیدہ خاتون، مقالات شبلی، (جلد ہشتم)، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ۔

شبلی نعمانی (۱۹۲۸ء)، مکاتیب شبلی، (جلد اول ودوم) مرتبہ سید سلیمان ندوی، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ۔

عبدالرشید نعمانی (۲۰۰۲ء) تاریخ تدوین حدیث، سید احمد شہید اکیڈمی، دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

عبدالماجد دریا بادی، مولانا (۱۹۹۶ء)، عبدالماجد دریا بادی۔ آپ بیتی، مقدمہ از ابوالحسن ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

عزیز، عزیز الرحمان (۱۹۳۹ء) حیات محمد بہاول خان خامس عباسی، عزیز المطابع، بہاول پور۔

قمرالزمان عباسی (۱۹۹۲ء)، صاحبزادہ، بہاول پور کا صادق دوست، سٹنلے پرنٹرز، لاہور۔

محمد صادق (۲۰۱۴۔۲۰۱۶ء)، جامعہ عباسیہ وعلمائے جامعہ عباسیہ کا تعارف اور ان کی علمی خدمات، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ، شعبۂ علوم اسلامیہ، بہاول پور۔

محمد طاہر (۲۰۱۰ء) ریاست بہاول پور کا نظم مملکت (۱۸۶۶ تا ۱۹۴۷ء)، بزم ثقافت، ملتان۔

محمد علی حسن خان (سال ندارد)، روداد اجلاس بست ودوم ندوۃ العلماء بہ مقام امرتسر، باہتمام مرزا محمد جواد، درس نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

معین الدین احمد ندوی (۲۰۱۱ء)، حیات سلیمان۔ یعنی ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندوی کی سوانح حیات اور علمی وعملی کارنامے، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہند۔

منور علی خان (سال ندارد)، ایس ای کالج کے سو سال (۱۸۸۶۔۱۹۸۶ء) صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور۔

اخبار وجرائد:

گورنمنٹ گزٹ بہاول پور (۱۷/جولائی، ۱۹۵۲ء)، مطبع صادق الانوار، بہاول پور۔

حفیظ، حفیظ الرحمان (دسمبر، ۱۹۴۳ء)، بزم عزیز، العزیز، عزیز المطابع، بہاول پور۔

www.shibliacademy.org

رحمت، عبدالرشید (۱۹۹۴ء، نمبر۴)، علمائے بہاول پور۔ایک جائزہ، الزبیر، بہاول پور نمبر، اردو اکیڈمی، بہاول پور۔

سلیمان ندوی (مئی ۱۹۴۰ء)، شذرات، معارف، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔

سلیمان ندوی (اکتوبر ۱۹۴۳ء)، صبح صادق، معارف دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔

سلیمان ندوی (۱۹۸۲ء)، خطبہ سید سلیمان ندوی، الزبیر، شمارہ ۱، بہاول پور نمبر۔

عزیز، عزیز الرحمان (مئی ۱۹۴۰ء)، بزم عزیز، العزیز، عزیز المطابع، بہاول پور۔

عزیز، عزیز الرحمان، ''نوادر کتب خانۂ سلطانی''، العزیز، اپریل ۱۹۴۰ء، عزیز المطابع، بہاول پور۔

عطا خورشید (نومبر۔دسمبر ۲۰۱۴ء) ''علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی۔کتاب خانۂ حبیب گنج کی روشنی میں''، معارف، اعظم گڑھ، ہند۔

فرخ سلیم انصاری (۱۹۹۴ء) ''اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور'' الزبیر، سہ ماہی، (بہاول پور نمبر)۔اردو اکیڈمی۔

ناظم ندوی، محمد (۱۹۸۲ء)، بہاول پور کی یادیں، الزبیر، بہاول پور نمبر، شمارہ ۱، اردو اکیڈمی، بہاول پور۔

websites:

راشد شیخ، نامور عالم اور عربی دان مولانا ناظم ندوی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری، جسارت، سنڈے میگزین، ص ۱؛

(https://fridayspecial.com.pk)

وحید الدین، مولانا، سید ابوالحسن ندوی، ایک ہمہ جہت شخصیت، دلیل، یکم جنوری ۲۰۱۷ء۔

(https://daleel.pk)

الندوہ

(جنوری ۱۹۰۴ء تا مئی ۱۹۱۲ء)

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ ''الندوہ''۔اس عمدہ اور دیدہ زیب عکسی ایڈیشن (۹ جلدوں) کی قیمت: ۴۷۳۵/روپے

www.shibliacademy.org

اسلامی شریعت اور دھرم شاستروں کا تقابلی جائزہ

(وراثت اور طلاق کے حوالہ سے)

ڈاکٹر محمد احمد نعیمی

لاعلمی یا کسی چیز سے ناواقفیت بہت سی غلط فہمیوں اور برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ مقولہ دور حاضر میں ہندو مسلم اقوام پر بھی کم وبیش صادق آتا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ دونوں مذاہب کی اصلی تعلیم وحقیقت سے بے خبر ہیں اور اسی وجہ سے بے شمار غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا شکار ہیں مزید یہ کہ اسلام اور ہندو دھرم کی تعلیمات کیا ہیں اور ان میں باہمی تعلق اور فرق کیا ہے؟ اس موضوع پر سنجیدگی کے ساتھ ابھی تک کوئی قابل ذکر کام ہوا بھی نہیں ہے اور نہ ہی آج اس موضوع پر کوئی خاص توجہ دی جارہی ہے۔ جب کہ ہندوستانی مذہبی کتب کا اگر بہ نظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو بہت سی ایسی حیرت انگیز چیزیں سامنے آتی ہیں کہ انسان پر حیرت واستعجاب کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور اس کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن یا اسلام کے ذریعہ جو کچھ پیغام دیا گیا ہے اس کا کافی حصہ بعینہٖ یا قدرے فرق کے ساتھ قدیم ہندوستانی مذہبی کتب کے اندر بھی پایا جاتا ہے اور ان کتب سے بھی ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جو اسلام اپنے روز اول سے آج تک بیان کرتا چلا آرہا ہے اگرچہ زمانہ کے تغیر اور تبدل کے ساتھ آج ان کی صورتیں کہیں گنجلک اور کہیں مسخ ہوکر رہ گئی ہیں۔

مذہب اسلام یا دیگر ہندوستانی مذاہب کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات نہ ہونے کے باعث ہی ہندوستان میں بہت سے فتنہ وفساد جنم لیتے ہیں، ایسی حالت میں مذہب اسلام اور دیگر ہندوستانی مذاہب کا تقابلی مطالعہ معاشرتی وسماجی میل جول کے ارتقاء کے لیے انتہائی ضروری ہے تاکہ

استاذ شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی۔

www.shibliacademy.org

اس کے ذریعہ ایک دوسرے کو سمجھا جاسکے اور انصاف کی نظروں سے غور وفکر کر کے کوئی صحیح نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہزار سالوں سے ہندوستان میں رہتے چلے آرہے ہیں لیکن ابھی تک ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے۔ ہندو کے لیے مسلمان ایک راز ہے اور مسلمان کے لیے ہندو ایک معمہ۔ نہ ہندو کو اتنی فرصت ہے کہ اسلام کے حقائق کی چھان بین کرے نہ مسلمان کو اتنی مہلت کہ ہندو دھرم کے حقائق کی تہہ تک پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر بے سر وپیر کی باتوں کا تصور کر کے لایعنی بحث پر آمادہ رہتے ہیں۔

اسی مقصد کے پیش نظر میں نے ''اسلامی شریعت اور دھرم شاستروں کا تقابلی جائزہ'' مضمون تحریر کیا ہے تاکہ اہل علم کی اس جانب بھی کماحقہٗ توجہ مبذول کی جائے۔

اسلام میں عورت کا حق وراثت: پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت اور نزول قرآن سے قبل عہد جاہلیت میں ساری دنیا بالخصوص جزیرۂ عرب کے لوگ لڑکیوں وعورتوں کو جائداد و ترکہ سے حصہ نہیں دیتے تھے۔ یہ دستور دنیا کے بہت سے مذاہب واقوام میں آج بھی جاری وساری ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے نہ صرف ان کو مالی وموروثی حقوق عطا فرمائے بلکہ ان کے حقوق کی مکمل نگہداشت بھی فرمائی۔ اسلام نے حکم دیا کہ عورتوں کو اپنے مال وملکیت کا مکمل مالکانہ حق حاصل ہے اس میں کسی دوسرے کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کہ وہ دوسرا شخص اس کا شوہر ہو، والد ہو، بھائی ہو یا کوئی اور ہو۔ اس کے علاوہ اسلام نے عورتوں کے واسطے مال ودولت کے حصول و آمدنی کے لیے جائز ومناسب راہیں بھی ہموار کیں جس کے تحت ایک عورت اسلامی شریعت کے دائرہ میں رہ کر پروقار انداز میں کسب مال ومعاش کرسکتی ہے۔ مثلاً: ''وہ خود یا کسی کے ساتھ شامل ہوکر تجارت کرسکتی ہے، اپنا مال ورقم کسی کارخانے یا صنعت میں لگاسکتی ہے اور پردے کے ساتھ محنت و مزدوری کرسکتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں جو آمدنی ہوتی ہے اس کی مالک وہ خود ہوتی ہے۔ اسی طرح شادی کے موقع پر اعزہ واقرباء یا شوہر کی جانب سے جو رقم ومال تحفتہً حاصل ہوتا ہے یا مہر ملتا ہے اسلامی شریعت کے مطابق اس کی بھی مکمل حقدار عورت ہی ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے عورت کو جہاں اور بہت سے اعلیٰ انسانی حقوق دیے ہیں وہیں ایک

www.shibliacademy.org

اہم ترین حق یہ بھی دیا ہے کہ مردوں کی طرح اس کا بھی ماں، باپ اور بیٹے کی جائداد سے حصہ متعین کیا ہے۔ اور عورت ماں ہو یا بیٹی یا بیوی کسی صورت میں اس کو میراث سے محروم نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوَاهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔(۱)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں۔ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ پھر اگر سب لڑکیاں ہوں اگر چہ دو سے اوپر تو ان کو ترکہ کا دو تہائی اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کا آدھا۔ اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کو اس کے ترکے سے چھٹا حصہ اگر میت کے اولاد ہو۔ پھر اگر اس کی اولاد نہ ہو اور ماں باپ چھوڑے تو ماں کا تہائی حصہ۔ پھر اگر اس کے کئی بہن بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا، بعد اس وصیت کے جو کر گیا اور قرض کے۔ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم کیا جانو کہ ان میں کون تمہارے زیادہ کام آئے گا یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے اللہ کی جانب سے۔

اس آیت کریمہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کے حصوں میں کمی بیشی کی ہے اور عورت پر زیادتی کی ہے لیکن اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ ان کے مابین جو حصے کا فرق رکھا ہے اس کا مقصد صنف نازک پر زیادتی و ظلم نہیں بلکہ حقوق و فرائض کے درمیان توازن کی بقاء ہے۔ اور ہر ایک کی ذمہ داریوں کے مطابق اس کے لیے میراث میں حصے کا نفاذ ہے۔ کیونکہ اسلامی دستور کے مطابق مرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عورت کا مہر ادا کرے۔ رہنے سہنے، کھانے پینے کے اخراجات برداشت کرے اور بیوی بچوں کی اچھی طرح مکمل تربیت و کفالت کرے لیکن اس کے مقابلہ میں عورت پر اس طرح کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اسلام نے اسی فرق کی بنیاد پر میراث میں مرد و عورت کے حصے میں فرق رکھا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے غور کیا جائے تو یہ فرق سراسر رحمت

www.shibliacademy.org

اورعورت کے لیے غیر معمولی ہمدردی ورعایت ہے۔اس لیے کہ اس پر کسی طرح کی کوئی مالی ذمہ داری بھی عائد نہیں اس کے باوجود مرد کے مقابلے میں نصف حصہ دیا ہے۔اور ایک خاص رعایت یہ کی ہے کہ لڑکی کا یہی نصف حصہ میراث کی تقسیم کی اکائی قرار دیا گیا ہے، سارے حصے اسی کے حساب سے شمار کیے جائیں گے اور ساری تقسیم اس کے مطابق ہوگی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ''۔لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے برحق ہے۔لیکن اس فرمان کی روشنی میں یہ کہنا یا سمجھنا سراسر غلط ہے کہ جملہ حالات میں عورت کو مرد کے مقابلہ میں آدھا حصہ ہے۔اس لیے کہ قرآن وسنت سے ماخوذ اسلامی علم میراث کی روشنی میں تقریباً دس سے زیادہ صورتوں میں عورت کو مرد سے زیادہ حصہ داری ملتی ہے اور کئی صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورتوں کو مردوں کے برابر حصہ ملتا ہے اور بعض صورتیں تو ایسی ہیں کہ عورت کو حصہ ملتا ہے جب کہ اس کے برابر والے مرد کو نہیں۔صرف چار صورتیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد کے حصے کا آدھا ملتا ہے اور کبھی کم بھی ملتا ہے۔اس طرح اگر حساب لگایا جائے تو جائداد و میراث میں عورت کے حصے کا تناسب و مقدار مرد سے ساڑھے سات گنا زیادہ ہے۔(۲)

میراث کی آیتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مختلف حالتوں میں عورت کے مختلف حصے ہیں، کہیں وہ نصف کی حقدار ہے کہیں اس سے زیادہ کی اور کہیں اس سے کم کی۔چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ۔(۳)

اور تمہارے ترکہ میں بیویوں کے لیے چوتھائی ہے اگر تمہارے اولاد نہ ہو پھر اگر تمہارے اولاد ہو تو ان کا تمہارے ترکے میں سے آٹھواں حصہ ہے۔تمہاری وصیت پوری کرنے اور تمہارا قرض ادا کرنے کے بعد۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ

اے نبیؐ! آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ فرمادیجیے کہ اللہ تمہیں کلالہ (جو بے اولاد ہو اور جس کے ماں باپ اور دادا، دادی زندہ نہ ہوں) کے متعلق فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کسی مرد کا انتقال ہو جو بے اولاد ہو اور

www.shibliacademy.org

كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْا اِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔ (۴)

اس کی ایک بہن ہو تو ترکہ میں اس کی بہن کا آدھا ہے۔ اور مرد اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن کی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر دو بہن ہوں تو ترکہ میں ان کا دو تہائی اور اگر بھائی بہن ہوں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

عورت کو ماں، بیٹی، بہن اور بیوی تمام صورتوں میں والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ سے وارثت میں حصہ ملے گا، قرآن پاک میں اس کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن احادیث رسولؐ میں اس کو بڑی تفصیل و توضیح کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ:

اذا ترک رجل او امرأة بنتًا فلهن الثلثان وان كان معهن ذكر بدئ بمن شركهم فيوتى فريضته فما بقى فللذكر مثل حظ الانثيين۔ (۵)

جب کوئی مرد یا عورت بیٹی چھوڑے تو اس کے لیے نصف اور اگر وہ دو یا زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی اور اگر ان کے ساتھ بیٹا بھی ہو تو دوسرے شرکاء کو دے کر باقی مال سے مرد کو عورت سے دوگنا دیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ عورت کے حق میں اسلامی نظام میراث اپنی جگہ مکمل ہے۔ عورت قرآن و سنت کے مطابق اپنے باپ، ماں، شوہر، اولاد اور دیگر قریبی رشتے داروں سے وراثت میں حصہ پاتی ہے اور اپنے ترکے و مال کی خود مالک و مختار ہوتی ہے۔

ہندو دھرم میں عورت کا حق وراثت: دھرم گرنتھوں و دھرم شاستروں کی تعلیمات کی روشنی میں عورت عمر کے کسی بھی حصے میں آزاد نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ ایک غلام کی طرح زندگی کے ایام گزارتی ہے۔ بچپن میں وہ ماں باپ کے تابع ہوتی ہے، جوانی میں شوہر کے ماتحت ہوتی ہے اور بڑھاپے میں بیٹوں کی نگرانی میں رہتی ہے۔ اس طرح اس کی تمام زندگی کا دارومدار دوسروں پر ہوتا ہے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کے منحصر ہونے اور کسی صورت میں اس کے آزاد نہ ہونے کی وجہ سے ہی غالباً قدیم ہندو دھرم نے یہ دستور پیش کیا ہے کہ ”ماں باپ، شوہر اور دیگر اقربا کی جائیداد و ملکیت میں عورت کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بعض مقامات پر عورت کو کمزور و ناتواں قرار دے کر بھی وراثت کے

www.shibliacademy.org

حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ چنانچہ منواسمرتی کا فرمان ہے:

भार्या पुत्रश्च दासश्च त्रय एवाधनाः स्मृताः।
यत्ते समधिगच्छन्ति यस्य ते तस्य तद्धनम।। (6)

(بیوی، لڑکا اور خادم یہ تینوں مفلس (निर्धन) کہے گئے ہیں، کیونکہ ان کا کمایا ہوا مال اس کا ہوگا، جس کے یہ بیٹے، بیوی اور عورت ہیں)

न निर्हारं स्त्रियः कुर्युः कुटुम्बादबहुमध्यगात्।
स्वकदापि च वित्ताद्धि स्वस्य भर्तुरनाज्ञया।। (7)

(خاندان کے مختلف لوگوں کے مال میں سے عورتوں کو مال جمع نہیں کرنا چاہیے اور شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں سے بھی کچھ جمع نہیں کرنا چاہیے)

اصول دھرم شاستر میں ہے: دولت جو فنون دست کاری کے ذریعہ سے حاصل کی جائے یا باستثنا واسطہ داروں کے کسی اور سے از راہ محبت ملے اس پر ہمیشہ شوہر کا اختیار ہے۔(۸)

بودھایَن دھرم سوتر (बौधायन धर्मसूत्र) کا قول ہے:

निरिन्द्रिया अदायाश्च स्त्रियो मता इति श्रुतिः। (9)

(عورتیں بنا قوت کی ہیں، انہیں وراثت میں حصہ نہیں ملتا اور نہ ہی انہیں ویدک منتروں کا ہی حق ہے)

اسی طرح اتھروید (अथर्ववेद) اور یجروید (यजुर्वेद) میں قانون پیش کیا گیا ہے کہ:

''لڑکی باپ کی ملکیت کی حقدار نہیں''۔(۱۰)

اس طرح منتروں واشلوکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں، باپ اور شوہر کی جائیداد و مال میں عورت کا وراثت کے طور پر کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں تو پھر اس کا اپنا کون سا مال ہوتا ہے اور وہ کس مال کی مالک و مختار ہوتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے منواسمرتی کہتی ہے کہ:

अध्यग्न्य ध्यावांहनिकं दत्तं च प्रतिकर्मणि।
भ्रातृमातृपितृ प्राप्तं षड् विद्यं स्त्री धनं स्मृतम।। (11)

(شادی کے موقع پر اگنی (अग्नि) کو گواہ (साक्षी) مان کر عورت کو دیا جانے والا تحفہ یا مال (अध्याग्नि)، عورت کو

www.shibliacademy.org

اپنے باپ کے گھر سے شوہر کے گھر رخصت ہوتے وقت ملا ہوا مال (अध्यावाहनिक)، محبت سے دیا ہوا، بھائی، ماں اور باپ سے پایا ہوا مال یہ چھ قسم کے عورت کے مال ہوتے ہیں)

یہ چھ طرح کے عورت کے اپنے مال ہوتے ہیں، ان کو اگر کوئی خرد برد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دھرم گرنتھوں کے مطابق وہ سخت گنہگار اور دوزخی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں تنبیہ کرتے ہوئے منواسمرتی میں کہا گیا ہے:

स्त्री धनानि तु ये मोहादुव जीवान्ति बान्धवाः।

नारी यानानी वस्त्रं वा से पापा यारत्द्योगतिम्।। (12)

(جو شوہر، باپ، رشتے دار عورت کے مال، زیور، کپڑے اور سواری وغیرہ فروخت کر کے گزارا کرتے ہیں، وہ گنہگار (पातकी) اور جہنمی (नरकगामी) ہوتے ہیں)

پیش کردہ اشلوکوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں ماں، باپ یا شوہر کی ملکیت میں اگرچہ بطور وراثت عورت کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے لیکن ہمدردی و مہربانی کے طور پر وہ ماں، باپ، بھائی اور شوہر کے مال سے حصہ پا سکتی ہے۔ اس صورت میں عورت کو دھرم گرنتھوں میں کہیں متعین اور کہیں غیر متعین مقدار میں مال و دولت دینے کی بات کہی گئی ہے۔ رگوید میں ہے کہ:

अमाजूरिव पित्रोः सच सती समानादा सदससत्त्वामिये भगम्।

कृधि प्रकेतमुप मास्या भर ददधि भागं तन्वो येन मामहः।। (13)

(زندگی بھر باپ کے گھر رہنے والی عورت کی طرح، ماں، باپ کے ساتھ رہنے والی لڑکی آبائی گھر سے ہی دولت مانگتی ہے۔ غور کر کے اور حساب لگا کر اس کو مال دو۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے اس کا حصہ دے دو، جس سے وہ مہمان کی خاطر و مدارات کر سکے)

اس منتر میں غیر شادی شدہ لڑکی کے لیے وراثت (दायभाग) کا بندوبست کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو لڑکی شادی نہیں کرتی ہے اور اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی زندگی گزارتی ہے، اس کو آبائی جائیداد و ملکیت سے مناسب حصہ ملنا چاہیے۔ اس منتر سے جہاں غیر شادی شدہ (अविवाहित) لڑکے کے تئیں وراثت پانے کا ثبوت ملتا ہے وہیں دوسری طرف یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جن لڑکیوں کی شادی ہوگئی ہو ان کو آبائی دولت سے وراثت کا حق (दायभाग) نہیں ملے گا۔ صرف غیر شادی شدہ لڑکی ہی

www.shibliacademy.org

لڑکوں کے مثل وراثت کی مستحق ہے اور یہ دستور اس لیے ہے تاکہ وہ ضرورت کے مطابق آزادی کے ساتھ اپنی گزر بسر کر سکے اور کسی کی محتاج نہ رہے۔ ویدوں کے اس نظام کی وضاحت منواسمرتی سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

स्वेभयो ऽ शेभ्यस्तु कन्याभ्यः प्रदद्युर्भ्रातरः पृथक्।

स्वात्स्वादशाच्चतुर्भाग पतिता स्युत दित्सवः।। (14)

(لڑکی (غیر شادی شدہ بہنوں) کو سبھی بھائی اپنے حصوں میں سے علاحدہ دیں۔ جو بھائی بہن کی شادی کے لیے اپنے مال کا چوتھا حصہ نہیں دیتے وہ ذلیل ہوتے ہیں)

जनन्यां संस्थितायां तु समं सर्वे सहोदराः।

मजेरन्मातृकं रिक्थं भगिन्यश्च सनाभयः।। (15)

(ماں کے مرنے کے بعد سبھی بھائی اور کنواری بہنیں ماں کے ترکہ و مال کو برابر تقسیم کرلیں)

मातृस्तु यौतकं यत्स्यात्कुमारो भाग एव सः।

दोहित्र एव च हरेद पुत्रस्यारिवल धनम।। (16)

(ماں کی شادی کے وقت زیورات وغیرہ جوان کے باپ وغیرہ سے ملے ہوں وہ سارے زیورات غیر شادی شدہ لڑکیوں کو ملنا چاہئیں اور لاولد نانا کا سارا مال نواسے کو لینا چاہیے)

منو نے کنواری لڑکیوں اور بہنوں کے علاوہ نواسیوں کو بھی نانی کے مال سے کچھ نہ کچھ مال بطور خوشی دینے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

यास्तासां स्युर्दुहितरस्ता सामपि यथार्हतः।

मातामहमा धनात्किं चित्प्रदेयं प्रीतिपूर्वकम्।। (17)

(بہن کی کنواری لڑکیوں کو بھی نانی کے مال میں سے اپنی خوشی سے ان کے اطمینان کے لیے کچھ دینا چاہیے)

اس طرح دھرم گرنتھوں سے منقول منتروں و اشلوکوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں عورت کے لیے اگرچہ ماں، باپ یا شوہر کی ملکیت و مال سے بطور وراثت کوئی خاص حصہ متعین نہیں ہے لیکن ان کی شادی، خوش حالی اور ضروریات زندگی کے لیے ہمدردی و مہربانی کے طریقہ پر مختلف مقدار میں وراثت کا حصہ دینے کا حکم ہے۔

www.shibliacademy.org

معلوم ہو کہ ہندو دھرم میں وراثت (Inheritance) کے دو مذہب (Two school of Thougths) یا دو نظریے ہیں (۱) دائے بھاگ (दायभगा)، (۲) متاکشرا (मिताक्षरा) دائے بھاگا آسام اور بنگال وغیرہ میں پایا جاتا ہے اور متاکشرا پورے انڈیا میں پایا جاتا ہے۔ یعنی ترکہ و جائیداد کیسے تقسیم ہوگی اس میں ہندو دھرم میں دو نظریات (View) ہیں ایک کے مطابق جیسے ہی بچہ گھر میں پیدا ہوا، پیدا ہوتے ہی اس کو پراپرٹی میں حصہ مل گیا اور دوسرا نظریہ کہتا ہے نہیں جب تک باپ زندہ ہے کسی کو کوئی حصہ نہیں ملے گا باپ کے بعد ہی ملے گا۔ یعنی دونوں قوانین میں بیٹے کو حق وراثت ہے بیٹی کو نہیں ہے۔

اسلام میں طلاق: طلاق اسلام کے عقد و مناکحت اور عائلی قانون کا ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے، جو مرد و عورت کی نہیں بلکہ سماج کی بھی ایک سخت ضرورت ہے اور جس طرح اسلام میں نکاح کا ایک خاص اور بہت ہی پاک مقصد ہے اسی طرح طلاق کا بھی ایک مقصد ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی آمد سے قبل ساری دنیا میں یہ دستور تھا کہ مرد چاہے کیسا بھی ظالم و بدکار ہو، عورت کے حقوق ادا کرتا ہو یا نہ کرتا ہو اور اس کے ساتھ کتنا ہی غیر انسانی و جانوروں جیسا سلوک کرتا ہو، عورت کو کسی بھی صورت میں اس سے نجات پانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں طلاق کا رواج تھا لیکن بہت ہی عجیب و غریب انداز میں۔ اور قدیم ہندوستان میں یہ تھا کہ جب ایک عورت کسی مرد کے ساتھ اگنی کے سات پھیرے لے لیا کرتی تھی تو پھر بری سے بری حالت میں بھی اس کو ظالم شوہر سے آزادی حاصل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہاں تیاگ کا رواج تھا یعنی جب چاہا عورت کو گھر میں رکھ لیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا بھی انتہائی افسوس ناک حال تھا۔ اہل عرب عورتوں کو تکلیف دینے اور نقصان پہنچانے کے لیے کثرت سے طلاق کا استعمال کرتے تھے اور جب چاہتے، جتنی چاہتے اتنی طلاق دے دیا کرتے تھے اور پھر واپس کر لیا کرتے تھے۔ ان کا یہ حق کبھی ختم نہیں ہوتا تھا، اس طرح وہ عورت کو نہ چھوڑتے تھے، نہ ہی چین سے رہنے دیا کرتے تھے اور نہ ہی ان کے حقوق ادا کرتے تھے۔ (۱۸)

اسلام نے اس غیر انسانی، ظالمانہ اور ذلت آمیز دستور اور پراگندہ رسم کا سد باب کرنے، عورتوں کو اس ظلم سے نجات دلانے اور ان کے واجب حقوق کی بازیابی کے لیے طلاق کا قانون نافذ

www.shibliacademy.org

فرمایا۔ مرد کو طلاق دینے کا حق دیا تو عورت کو طلاق لینے اور مانگنے کا اختیار دیا۔ لیکن کسی بھی حالت میں اسلام نے طلاق کی عام اجازت نہیں دی بلکہ سب سے آخر میں اس صورت میں اس کے استعمال کی اجازت مرحمت کی کہ جب شوہر اور بیوی کے درمیان صلح وصفائی اور اتحاد کے سارے راستے بند ہو گئے ہوں۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (۱۹)

اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور ان سے الگ سوؤ اور انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری فرماں بردار ہو جائیں تو ان پر ہرگز سختی نہ کرو، بے شک اللہ بلند اور بڑا ہے۔ اور اگر تم کو میاں بیوی کے جھگڑے کا خوف ہو تو ایک پنچ مرد والوں کی طرف سے بھیجو اور ایک پنچ عورت والوں کی طرف سے۔ یہ دونوں اگر صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان میں میل کر دے گا، بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن نے مرد وعورت کو باہمی نفرت واختلاف کی صورت میں زیادہ سے زیادہ صلح وصفائی اور اتحاد کی ہدایت وتاکید کی ہے، پنچ مقرر کرنے کی بات کہی ہے، سمجھانے، کنارہ کشی اختیار کرنے اور ہلکی سختی کرنے کی تعلیم دی ہے تاکہ اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے اور آپسی میل محبت کی راہ پھر سے ہموار ہو جائے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود اگر زوجین صلح وصفائی کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو سکیں اور صلح کا کوئی راستہ ممکن نہ ہو تو بحالت مجبوری، مخدوش حالات میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بھی اگر اسلام طلاق کی اجازت نہیں دیتا تو پھر عورت یا مرد پر ظلم وستم مزید بڑھ سکتا تھا اور نفرت واختلاف خطرناک فساد کی شکل میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

ان خاص حالتوں اور مجبوریوں میں طلاق کی اجازت کے باوجود اسلام طلاق کو کبھی پسند نہیں کرتا ہے بلکہ آخری قدم کے طور پر اس کی اجازت بدرجۂ مجبوری عطا کرتا ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

www.shibliacademy.org

ارشاد فرماتے ہیں:

ما احل اللہ شیئًا ابغض الیہ من الطلاق (۲۰)	اللہ نے جتنی چیزیں انسانوں کے لیے حلال کی ہیں، ان میں سے طلاق کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔
ابغض الحلال الی اللہ الطلاق (۲۱)	اللہ تعالیٰ کو حلال اشیاء میں طلاق سب سے ناپسند ہے۔

اس طرح اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی ہے وہاں یہ ہدایت و نصیحت بھی کی ہے کہ یہ اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض و ناپسند چیز ہے۔ لہٰذا چھوٹی چھوٹی باتوں، معمولی غلطیوں اور بے وجہ کی ناراضگیوں پر طلاق کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس کا مقصد خانگی و عائلی زندگی کو برباد کرنا نہیں بلکہ نفرت و اختلاف اور فساد کا دروازہ بند کر کے مامون و خوش حال زندگی کا از سر نو موقع فراہم کرنا ہے۔ اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲۲)	اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد پوری ہو جائے تو اے عورتوں کے والیو! انہیں نہ روکو اس بات سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ آپس میں موافق شرع رضامند ہو جائیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں طلاق کے ضروری اصول بیان کیے ہیں وہیں طلاق سے متعلق بہت سے جاہلانہ طور طریقوں میں اصلاحات بھی کی ہیں اور وہ اس طرح کہ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ عورت کو طلاق دیتے اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لیتے۔ یعنی جب جب طلاق کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو رجوع کر لیتے اور پھر طلاق دے دیتے۔ اس طرح عمر بھر اس کو قید رکھتے تھے۔ قرآن پاک نے اس جاہلانہ و ظالمانہ دستور کا خاتمہ کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ وہ طلاق کہ جس میں بیوی سے رجوع ممکن ہے صرف دو بار تک ہے اس کے بعد طلاق دینے پر رجوع کا حق بالکل نہیں۔ (۲۳)

اسی طرح اگر کسی عورت کو شوہر سے نفرت ہوتی یا اس کے ظلم و ستم کا شکار ہوتی تو اس کو آزادی

www.shibliacademy.org

پانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اسلام نے ایسی صورت میں اس کو پریشانی سے نجات دلانے کے لیے خلع یعنی کچھ رقم یا مال کے عوض طلاق مانگنے کا اختیار عطا فرمایا۔

اس طرح قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام کا قانون طلاق مرد وعورت اور انسانی سماج کے لیے باعث تکلیف یا زحمت نہیں بلکہ سراپا رحمت ہے۔

اسلامی قانون طلاق سے متعلق ایک وضاحت: اسلام میں طلاق کا حق مرد کو دیا گیا ہے اور عورت کو طلاق لینے اور مانگنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اس طرح اسلام نے عورتوں کے ساتھ زیادتی کی ہے اور صرف مردوں کو طلاق کا حق دے کر اور عورتوں کو اس سے محروم رکھ کر حق تلفی وناانصافی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جو مرد کو طلاق دینے کا حق دیا ہے، اس کے پس پشت بہت سی مصلحتیں وحکمتیں کارفرما ہیں۔ اور وہ یہ کہ نکاح اور ازدواجی زندگی کی تقریباً ساری ذمہ داری مرد کے کاندھوں پر ہوتی ہے، اسے نکاح اور عائلی زندگی کے حقوق ادا کرنے اور اس کو صحیح وخوش حال بنانے کے لیے بہت زیادہ مالی وجسمانی بار اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک طرف اگر وہ نکاح اور مہر وغیرہ میں حسب حیثیت مال خرچ کرتا ہے تو دوسری طرف تاحیات اس رشتے کو صحیح سالم رکھنے کی مکمل جدوجہد کرتا ہے، کیونکہ طلاق دینے کی صورت میں اس کو بہت بڑا مالی وجسمانی نقصان اور پریشانی کا سامنا کرنا ہوگا، مہر ادا کرنا ہوگا، عدت کے اخراجات برداشت کرنا ہوں گے، اس کا بنا بنایا آشیانہ برباد ہوگا، زندگی کا سارا چین وسکون غارت ہوگا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ طلاق کے بعد اس کو کوئی اور اچھی شریک حیات مل جائے۔ ان تمام مصائب وتکالیف کا خیال کرتے ہوئے جہاں تک ممکن ہوتا ہے مرد طلاق سے بچنے کی ہی کوشش کرتا ہے اور غصے کی حالت میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیتا ہے اور جب اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تب وہ بحالت مجبوری اس حق کا استعمال کرتا ہے۔ ان تمام وجوہات کے پیش نظر اسلام نے مرد کو طلاق دینے کا حق دیا ہے جب کہ عورتوں کا معاملہ یہ ہے کہ مرد کے بمقابل ان میں غصہ زیادہ ہوتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے، دوراندیشی کا مادہ کم ہوتا ہے، نازک مزاج ہونے کی وجہ سے برداشت کرنے اور معاف کرنے کی طاقت بھی کم ہوتی ہے، مرد کے مقابلے میں ان کے اندر انتقام کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، دوسروں کی غلط باتوں کا اثر بھی بہت جلد قبول کرتی ہیں اور پھر ان پر کسی طرح کی مالی ذمہ داری بھی نہیں ہوتی ہے اور طلاق واقع ہوجانے کے بعد

www.shibliacademy.org

ان پر وہ مالی اخراجات بھی نہیں ہوتے جو مردوں پر ہوتے ہیں۔ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام نے انہیں طلاق دینے کا اختیار نہیں دیا ہے۔اگر عورتوں کو طلاق کا حق دے دیا جاتا تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کا آزادی سے استعمال کرتیں،جس کا نتیجہ انتہائی خطرناک و تکلیف دہ ہوتا۔اس لیے کہ جن مغربی ممالک نے طلاق کا حق مردوں و عورتوں کو برابر دیا ہے جب ہم ان کے طلاق کے واقعات کا جایزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کچھ عورتوں نے صرف اس وجہ سے مرد کو طلاق دے دی کہ اس کا خاوند سوتے وقت خراٹے لیتا ہے۔اور ایک عورت نے طلاق کا سبب یہ بتایا کہ اس کا شوہر گھر میں دیر سے آتا تھا اور ایک عورت نے صرف اپنے کتے کی خاطر مرد کو طلاق دے دی۔تائیوان میں ایک خاتون نے اپنے شوہر کو اس لیے طلاق دے دی کیونکہ وہ اس کے میسیج کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔(انقلاب،دہلی،۱۹؍جولائی ۲۰۱۷ء)اور کبھی اس سے بھی چھوٹی و معمولی بات پر طلاق دے دی جاتی ہے۔اس طرح انہوں نے طلاق کو ایک کھلونا بنالیا اور اتنی زیادہ طلاقیں واقع ہونے لگیں کہ وہاں کا معاشرہ بھی اس کو آج ایک مصیبت خیال کررہا ہے۔

ہندو دھرم میں طلاق بنام تیاگ (त्याग): ہندو دھرم گرنتھوں و دھرم شاستروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کا ہندو دھرم و ہندو تہذیب میں کوئی مقام نہیں ہے۔شوہر چاہے کتنا بڑا ظالم و بدکار ہو اور بیوی پر روز نت نئی سختیاں کرتا ہو،ایسی صورت میں اگر بیوی چاہے کہ وہ طلاق لے کر ظلم و ستم سے آزادی حاصل کرلے تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ دھرم گرنتھوں کے دستور کے مطابق عورت کو ظالم شوہر سے نجات پانے یا طلاق مانگنے کا حق نہیں ہے۔اس لیے کہ جس عورت کے ایک بار کسی مرد کے ساتھ سات پھیرے (सप्तपदी) اور شادی کی مذہبی رسم विवाह संस्कार ادا ہوگئی تو پھر وہ تاحیات اس کی ہوگئی۔اب وہ چاہے کتنی بار اس کو چھوڑے یا بے عزت کرکے گھر سے نکالے،وہ اس کی زوجیت سے باہر نہیں ہوسکتی،وہ جب چاہے اس کو اپنے پاس بلاسکتا ہے اور جب چاہے گھر سے باہر نکال سکتا ہے۔اس اصول وضابطے کو منومہاراج اس طرح پیش کرتے ہیں:

न निष्क्रय विसर्गाभ्यां भर्तु र्भार्या वि मुच्चयते।

एवं धर्म विजानीमः प्राक्प्रजापति निर्मितम्।। (24)

(بیچنے یا چھوڑ دینے سے عورت شوہر کی زوجیت سے علاحدہ نہیں ہوتی ہے۔یہ مذہبی اصول ماضی میں پرجاپتی

www.shibliacademy.org

یعنی خالق نے بنایا ہے جس کو ہم جانتے ہیں)

مختصر یہ کہ ہندو دھرم گرنتھوں اور دھرم شاستر آچاریوں یعنی ہندو محققین ومفکرین علماء کے نزدیک یہ اصول وضابطہ ہے کہ ہوم (होम) اور سات پھیروں کے بعد طلاق نہیں ہوسکتا۔ اب ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ شوہر اور بیوی ہمیشہ محبت وپیار سے زندگی بسر کریں۔ منو مہاراج کہتے ہیں:

अन्योन्यस्या व्वभिचारो भवेदामरणान्तिकः।

एष धर्मः समासेन ज्ञेयः स्त्रीपु सयोः परः।। (25)

(مرد وعورت دونوں جب تک زندہ رہیں آپس میں میل محبت کے ساتھ سبھی مذہبی اعمال میں تعاون کرتے ہوئے رہیں۔ یہی شوہر اور بیوی کا مختصر مذہب ہے)

کسی بھی صورت یا کسی بھی حالت میں شوہر اور بیوی کے درمیان طلاق کیوں واقع نہیں ہو سکتی اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ہندو علماء ومحققین کہتے ہیں کہ "ہندو دھرم میں شادی ایک مذہبی سنسکار (پوجا ورسم) ہے"۔ رشتہ ازدواج کی حالت کا احساس اسی سنسکار سے ہوتا ہے۔ اگر شوہر یا بیوی ذلیل (पतित) ہوجائے تو سنسکار ختم نہیں ہوجاتا۔ اگر بیوی زنا کار ہوجائے تو بھی وہ بیوی ہی ہے اور کفارہ (प्रायाश्चित) ادا کر لینے کے بعد اس کو شادی کی مذہبی رسم دوبارہ ادا نہیں کرنی پڑتی، اس لیے طلاق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (۲۶)

ہندو دھرم میں طلاق کا اصول وقانون نہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن اگر عورت بدچلن، گستاخ، فتنہ پرور شریر اور سخت بیمار ہو تو اس کو چھوڑ دینے (त्यागने) کا حکم ہے لیکن اس صورت میں بھی زوجہ کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری شوہر پر ہوگی۔ (۲۷) کن حالات اور کن صورتوں میں شوہر کو بیوی چھوڑ دینا چاہیے اس کا دستور وضابطہ پیش کرتے ہوئے منواسمرتی میں کہا گیا ہے کہ:

विध्वित्प्रतिगृह्यापि त्यजेत्कन्यां विगर्हिताम्।

व्याधितां विप्रदुष्टां वा छदनना चोपपादिताम्।। (28)

(جو لڑکی بدکار، بیمار، عیب دار ہو یا فریب سے اچھی بتائی گئی ہو، ایسی لڑکی کو شادی کے اصول وقواعد کے مطابق قبول کر کے بھی چھوڑا جا سکتا ہے)

मद्यपा ऽ साधुवृत्ता च प्रतिकूला च या भवेत्।

www.shibliacademy.org

व्याधिता वाधिवेत्तव्या हिंस्त्रार्थध्नी च सर्वदा।। (29)

(شراب پینے والی، برے چال چلن والی، شوہر کے خلاف چلنے والی، بیمار، لڑائی جھگڑا کرنے والی اور فضول خرچ کرنے والی عورت کو چھوڑ دینا چاہیے)

اور اسی باب अध्याय کے اشلوک ۷۸ میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو عورت کسی بدکار، پاگل یا کمزور شوہر کا احترام وخدمت نہ کرے تو ایسی عورت کو اس کا شوہر اس کے زیورات لے کر تین ماہ تک چھوڑ دے۔

اس طرح مذکورہ بالا اشلوکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں عورت کو کم یا زیادہ مدت یا ہمیشہ کے لیے چھوڑا تو جا سکتا ہے لیکن طلاق نہیں دی جا سکتی۔(۳۰)

بیوی کی طرح اگر شوہر بھی نامرد، ذلیل، سنیاسی اور بدکردار ہو تو بعض دھرم شاستروں اور آچاریوں (مذہبی پیشواؤں) نے عورت کو بھی یہ اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ وہ اس کو چھوڑ سکتی ہے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں جیسا کہ نارد سمرتی اور منوا سمرتی سے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں کوٹلّے कौटिल्य نے بھی اپنے ارتھ شاستر میں بہت مناسب تجویز رکھی ہے اور وہ یہ کہ:

> ''اگر شوہر نہیں چاہتا تو بیوی کو چھٹکارا نہیں مل سکتا، اس طرح اگر بیوی نہیں چاہتی تو شوہر کو نجات نہیں حاصل ہو سکتی، لیکن دونوں میں آپسی اختلاف و نفرت ہے تو آزادی ممکن ہے اور شوہر بیوی سے خوف زدہ ہو کر اس سے جدا ہونا چاہتا ہے تو زوجہ کو شادی کے وقت جو کچھ ملا ہے اسے واپس کر دینے سے شوہر کو آزادی مل سکتی ہے۔ اسی طرح اگر بیوی شوہر سے ڈر کر اس سے الگ ہونا چاہتی ہے تو ان دونوں کی شادی کے وقت جو کچھ حاصل ہوا تھا اس کو نہیں لوٹائے گا اور ان دونوں صورتوں میں چھٹکارا تو ہوگا لیکن طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ اس کا ہندو دھرم میں کہیں کوئی وجود نہیں ہے''۔(۳۱)

آج ہندوستانی قانون میں جو عورت کو طلاق کا حق حاصل ہے وہ اسلام کی دین ہے کہ جب ۱۹۵۵ء میں ہندوستانی دستور میں شادی وطلاق کا قانون بنا تو اس میں پہلی بار اسلامی قانون طلاق کو سامنے رکھتے ہوئے ہندو ناری کو بھی طلاق کا حق دیا گیا جو اس کی مذہبی کتابوں کے بالکل

www.shibliacademy.org

برخلاف ہے۔

حوالہ جات

(۱) قرآن، سورۃ النساء، آیت ۱۱۔ (۲) سمپتّی میں عورتوں کا ادھیکار ص ۱۱ تا ۲۵، فہیم اختر ندوی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی۔ (۳) سورۃ النساء۔ آیت ۱۲۔ (۴) ایضاً، آیت ۱۷۶۔ (۵) صحیح بخاری ج ۳، کتاب الفرائض، باب ۹۲۲، حدیث ۱۶۳۷۔ (۶) मनुस्मृति, अध्याय 8, श्लोक 416۔ (۷) मनुस्मृति, अध्याय 9, श्लोक 199۔ (۸) तैत्तिरीय संहिता (6-5-8-2)۔ (۹) बौधायन धर्मसूत्र (2-2-53)۔ (۱۰) यजुर्वेद अध्याय 8, म० 5, अथर्वेद (1-17-1)، دھرم شاستر کا اتیہاس، بھاگ ۱، ص ۴۳، ۴۴، ڈاکٹر پانڈورنگ وامن کانڑے، اتر پردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء۔ (۱۱) मनुस्मृति, अध्याय 9, श्लोक 194۔ (۱۲) मनुस्मृति अध्याय 3 श्लोक 52۔ (۱۳) ऋगवेद, मं 2, सू 17 मं 7۔ (۱۴) मनुस्मृति अध्याय 9 श्लोक 118۔ (۱۵) मनुस्मृति अध्याय 9 श्लोक 192۔ (۱۶) मनुस्मृति अध्याय 9 श्लोक 131۔ (۱۷) मनुस्मृति अध्याय 9 श्लोक 194۔ (۱۸) خاتون اسلام، ص:۲۲۶ تا ۲۲۸، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، ادارہ البحوث الاسلامیہ، بنارس ۱۹۹۲ء۔ (۱۹) سورۃ النساء، آیت ۳۴، ۳۵۔ (۲۰) سنن ابوداؤد، ج ۲، کتاب الطلاق، حدیث ۴۱۰۔ (۲۱) مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، کتاب النکاح، باب الخلع والطلاق، حدیث ۱۱/۳۱۴۳۔ (۲۲) سورۃ البقرہ، آیت ۲۳۲۔ (۲۳) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۹، دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۲، ص ۴۹۹ تا ۵۲۷، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء۔ (۲۴) मनुस्मृति अध्याय 9, श्लोक 46۔ (۲۵) मनुस्मृति अध्याय 9, श्लोक 101۔ (۲۶) धर्मशास्त्र का इतिहास भाग 1, पृ० 346۔ (۲۷) धर्मशास्त्र का इतिहास भाग 1, पृ० 346۔ (۲۸) मनुस्मृति अध्याय 9, श्लोक 72۔ (۲۹) मनुस्मृति अध्याय 9, श्लोक 80۔ (۳۰) شادی بیوگان اور نیوگ، ص ۱۴، ثناء اللہ امرتسری، سلیم پریس امرتسر، ۱۹۱۷ء، मनुस्मृति अध्याय 9, श्लोक 79۔ (۳۱) धर्मशास्त्र का इतिहास भाग 1, पृ० 347۔

www.shibliacademy.org

خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور
تاریخ اور کارنامے

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے سلطان فخر الدین محمد تغلق عرف جونا شاہ نے دریائے گومتی کے کنارے ہموار زمین پر ایک شہر قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا کہ ۲۰ رسال تک ہندوستان کی بادشاہت کی ذمہ داری ادا کر کے ۷۵۲ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی سلطان فیروز شاہ تخت نشیں ہوا، اور ۷۷۲ھ میں جب وہ ملک بنگال کی بغاوت و سرکشی کو مٹا کر واپسی میں قصبہ مظفر آباد متصل جون پور خیمہ زن ہوا، تو بادشاہ کی نگاہ جانب مغرب لب دریائے گومتی ایک ہموار زمین پر پڑی اور چاہا کہ یہاں شہر آباد کرے، اسی شب بادشاہ نے ملک جونا کو خواب میں دیکھا کہ وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یہ شہر میرے نام سے موسوم ہو۔ صبح کو سوار ہو کر موقع کے معائنہ کے بعد ایک بلند مقام تجویز کر کے قلعہ بنانے اور اس کے اطراف میں شہر جون پور بسانے کا حکم دیا۔ سخنوران شاہی نے شہر جون پور کے لفظ سے تاریخ بنا نکالی۔ اس میں بادشاہ نے ہر فن کے اہل کمال کو نزدیک و دور سے بلا کر آباد کرایا تھا، اسی وجہ سے ایک زمانے میں یہ شہر سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت بن گیا جن کی وجہ سے اس شہر کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ علمائے عظام اور صوفیائے کرام کثرت سے یہاں کی خاک سے اٹھے، جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ سر دست اس وقت اسی قدیم تاریخی شہر کے ایک قدیم روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کی تاریخ اور اس کی دعوتی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید کا خاندانی پس منظر: آبا و اجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولوالعزم

شاہ صفی اکیڈمی، سید سروان، الٰہ آباد۔ (Mob: 9026981216)

www.shibliacademy.org

اولیاء وعلماء گزرے ہیں۔ان کے اجداد میں بارہویں پشت میں شیخ یحیٰی رومی کا نام آتا ہے، جنہوں نے اس خاندان میں ولایت کا جھنڈا گاڑا، جن کے بعد اس خاندان میں برابر اہل علم وعرفان پیدا ہوتے رہے۔حضرت شیخ یحیٰی رومی کے اجداد نے عرب سے آکر ملک روم میں کلدنامی مقام کو جائے سکونت بنایا۔اسی وجہ سے وہ رومی کہے جاتے ہیں۔روم میں تین پشت گزرنے کے بعد چوتھی پشت میں شیخ یحیٰی رومی نے روم سے دہلی کا سفر کیا۔اس وقت دہلی میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا سورج نصف النہار پر تھا۔سلطان المشائخ کے مرید ہوئے اور بارہ بنکی میں امیٹھی پرگنہ میں قیام پذیر ہوئے۔انھوں نے سلطان المشائخ کی وفات کے بعد روحانی نعمتیں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے حاصل کیں۔شیخ رومی کے بعد دسویں پشت میں شیخ عبدالحمید نامی ایک بزرگ ہوئے جو حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مرید خلیفہ(۱) اور بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے حقیقی دادا تھے۔ان کے دولڑکے ہوئے، مصطفیٰ اور عثمان۔دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہ پورنیہ بہار میں ہے۔شیخ عثمان کی اولاد امیٹھی میں بسی ہوئی ہے اور شیخ مصطفیٰ نے شیخ محمد رشید جیسا متبحر عالم اور عارف باللہ فرزند پایا، جس نے اپنے علم وعرفان سے ایک جہاں کو روشن کردیا۔(سمات الاخیار، ص ۳۲ تا ۳۴، ملخصاً)

بانی سلسلۂ رشیدیہ کا نسبی شجرہ: شیخ محمد رشید بن شیخ مصطفیٰ جمال الحق بن شیخ عبدالحمید بن شیخ راجو ابن شیخ سعدی بن شیخ عارف بن شیخ عبدالواسع بن شیخ منجھلے بن شیخ بڑے بن شیخ عبدالملک بن شیخ مٹھن ابن شیخ نصیر الدین بن حضرت مخدوم شیخ یحیٰی رومی بن سلطان تول بن شیخ حسام الدین بن شیخ سلطان نظام الدین بن سلطان شہاب الدین بن شیخ عبدالمنان بن شیخ عبدالسبوح بن حضرت شیخ سری سقطی بن حضرت شیخ مفلس سقطی بن شیخ ابان بن امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم۔(ایضاً، ص ۶۱)

ولادت، تعلیم وتربیت اور اجازت وخلافت: شیخ محمد رشید (۲) نے اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالم گیر کے دور بادشاہت کو دیکھا۔پیدائش عہد اکبری ۱۰۰۰ھ میں ہوئی اور جب چودہ سال کے ہوئے تو جہاں گیر تخت نشین ہوا، ان کی عمر ۲۷ سال کو پہنچی تو شاہ جہاں نے تخت شاہی کو سنبھالا اور جب ۶۸ سال کو پہنچے تو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ ہوا۔اس کی تخت نشینی کے پندرہویں یا سولہویں سال میں وہ ۸۳ سال کی عمر پاکر ۱۰۸۳ھ میں اس دار فانی کو خیر باد کہہ دیا۔(ایضاً، ص ۴۳)

وہ ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ میں ضلع جون پور کے موضع برونہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔

www.shibliacademy.org

جون پور کے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز جون پوری ثم دہلوی نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک فقیر پیدا ہوگا، جس کا نام محمد رشید ہوگا۔ ان کے علاوہ ایک اور بزرگ شیخ عبدالجلیل لکھنوی جوان کے بچپن میں برونہ میں تشریف لاتے تھے، انہیں دیکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ لڑکا عالم، عامل اور عارف کامل ہوگا۔ (ایضاً، ص ۶۲)

شیخ محمد رشید کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، متوسطات کی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی انہوں نے اپنے حقیقی ماموں مولانا شمس الدین اور استاذ العلماء شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی۔ علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے دہلی کا سفر کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے علم حدیث حاصل کرنا چاہتے تھے مگر شیخ نے پیرانہ سالی کی وجہ سے فرمایا کہ تم میری موجودگی میں میرے لڑکے سے علم حدیث حاصل کرو، اس طرح شیخ محمد رشید نے شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے اسناد حدیث حاصل کیں۔ (ایضاً، ص ۶۳، ۶۴)

وہ جب نو سال کے ہوئے تو اپنے والد گرامی شیخ مصطفی جمال الحق سے سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے اور کلاہ ارادت وخرقہ خلافت والد نے پہنایا۔ اگرچہ کم سنی کی وجہ سے والد کی حیات میں طریقۂ صوفیہ کی تحصیل کی طرف متوجہ نہیں ہوسکے لیکن خرقہ نے دل میں ایک جذبہ تو پیدا کر ہی دیا تھا۔ اس کے بعد ایک مدت تک تحصیل علوم میں مصروف رہے اور فراغت کے بعد درس وتدریس کی طرف مائل ہوئے مگر تصوف کا ذوق ضرور تھا اور کسی مرشد کامل کی تلاش بھی تھی۔ اسی زمانے میں قدوۃ السالکین مخدوم شیخ طیب بنارسی جون پور تشریف لاتے تھے۔ انہوں نے شیخ بنارسی سے ملاقات کی مگر اس مرتبہ دل مائل نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب میں وہ منڈواڈیہ بنارس تشریف لے گئے اور ان سے ملے۔ بہ مقتضائے کل امر مرھون۔ اس بار دل میں ایک محبت پیدا ہوگئی اور کچھ دن مخدوم کی خدمت میں رہ گئے اور اتنے دنوں میں سلوک کا ذوق وشوق ایسا پیدا ہوا کہ انہوں نے درس وتدریس کا مشغلہ ترک کر کے ان کی خدمت میں رہنا چاہا۔ شیخ نے اس بات کو پسند نہ کر کے فرمایا کہ تم وظیفہ صبح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے۔ اس کے بعد انہیں جون پور رخصت کر دیا۔

شیخ محمد رشید تعمیل ارشاد میں برابر مصروف رہے۔ رفتہ رفتہ مخدوم کی محبت وعقیدت بڑھتی گئی۔ اس درمیان اکثر وہ منڈواڈیہ جایا کرتے تھے اور دس پانچ دن رہ کر چلے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رمضان شریف میں وہاں گئے اور مخدوم کے حکم سے عشرۂ آخر میں اعتکاف کیا۔ اعتکاف میں ان پر

www.shibliacademy.org

بہت سے عجیب وغریب انکشافات ہوئے۔عین عید کے دن ایک مجمع عام میں مخدوم نے حضرات چشت کی طرف سے اپنا پیراہن پہنایا اور سلسلۂ چشتیہ کے اذکار اور تلقین کی اجازت دی اور جون پور رخصت فرمایا۔ان کا مزاج، عالی اور ہمت بلند واقع ہوئی تھی۔نعمتوں اور فیوض کی طلب میں وہ حریص تھے مگر ساتھ ہی دوسروں کو فیوض پہنچانے میں بھی سخی تھے۔جس بزرگ کا نام سنتے اس کے پاس جاتے، اگر اس میں اپنے سے زائد کچھ پاتے تو حاصل کرتے اور کم پاتے تو عطا کرتے۔باوجود یکہ مخدوم نے ان کو مستغنی بنادیا تھا، مگر ان کی بلند ہمت نے اتنے ہی پر قانع رہنے نہ دیا۔جب کبھی وہ منڈواڈیہ پہنچتے تھے تو دوسرے سلسلوں کے اشغال حاصل کرتے تھے حتی کہ سلسلۂ قادریہ وسہروردیہ وغیرہ کی اجازت وخلافت بھی مخدوم ہی سے حاصل کی۔(ایضاً،ص ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹)

اسی طرح میر سید شمس الدین کالپی بخاری جون پور آیا کرتے تھے۔ایک روز شیخ محمد رشید جب درس وتدریس میں مشغول تھے، میر صاحب ان کے قریب تشریف لائے اور متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو روحانی نعمت تمہارے حوالے کرنے کو بھیجا ہے، لو خدا نے مفت دیا ہے اور انہوں نے سلسلۂ قادریہ کی خلافت عطا فرمائی۔شیخ محمد رشید کو جب اشغال قلندریہ کے اخذ کا شوق ہوا تو شیخ عبدالقدوس قلندر جون پور کی خدمت میں جانے لگے اور ایک سال کامل حاضری دی۔اس مدت میں نہ کبھی شیخ نے پوچھا کہ کیوں آتے ہو، نہ انہوں نے ظاہر کیا کہ اس لیے آتا ہوں۔سال بھر کے بعد ایک مرتبہ شیخ نے فرمایا کہ اچھا آدھی رات کے بعد آیا کرو۔وہ بہت خوب کہہ کر واپس آئے اور یہ نہ کہا کہ آدھی رات سے پہلے ہی پل کا پھاٹک بند ہوجاتا ہے۔اولاً تیرنے کا فن سیکھا اور شب کو تیر کر اس پار جاتے اور علم قلندریہ سیکھتے۔چند روز میں انہوں نے فراغت واجازت حاصل کی۔بعدۂ سلسلۂ مداریہ وفردوسیہ ان ہی سے حاصل کیا۔اس کے بعد شیخ عبدالقدوس قلندر کے پاس جب کوئی طالب آتا تو یہی فرماتے کہ اب میں ضعیف ہوا، میاں محمد رشید ذکر خوب کرتے ہیں، ان کے پاس جاؤ۔(ایضاً،ص ۷۱، ۷۳)

شیخ محمد رشید کو جب یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ سلسلۂ چشتیہ وقادریہ شاہ حسام الحق مانک پوری کے خاندان سے بھی حاصل کرلیں تو وہ تین بزرگوں کے ساتھ مانک پور راجی سید احمد مجتبیٰ کے پاس حاضر ہوئے۔اندر سے کھانا آیا جس میں شیر برنج بھی تھا۔انہوں نے ہر قسم کے کھانے کھائے اور ایک نے کچھ نہ کھایا۔راجی نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ جس نے سب کچھ کھایا اس نے دین ودنیا سب کچھ پایا،

www.shibliacademy.org

جس نے شیر برنج کھایا، وہ فقط عقبیٰ لے گیا، جس نے کچھ نہیں کھایا، اس نے کچھ نہیں پایا۔ مختصر یہ کہ راجی بکمال عنایت وشفقت پیش آئے اور چند روز رکھ کر اپنے سلسلے کی اجازت وخلافت عطا فرمائی۔ (ایضاً، ص ۷۵ تا ۷۷)

خانقاہ رشیدیہ جون پور کا قیام: راجی سید احمد مجتبیٰ سے روحانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد مانک پور سے جب واپس ہوئے تو جون پور میں راجی کے حکم کے مطابق ایک خانقاہ قائم کی اور پھر رشد وہدایت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا، جو آج تک جاری ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس خانقاہ کے قیام کی تاریخ کیا تھی، مگر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس وقت محمد رشید بانی خانقاہ کی عمر تقریباً ۴۰ رسال کی تھی، گویا ۱۰۴۰ھ کے آس پاس اس خانقاہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ تقریباً چار سو سال قدیم خانقاہ ہے جہاں سے آج بھی علم وعرفان، رشد وہدایت اور خدمت خلق کا کام اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے اور موجودہ سجادہ نشین مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف قیادت میں یہ خانقاہ اور اس سے متعلق چند دیگر خانقاہیں آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں۔ صاحب سمات الاخیار تحریر فرماتے ہیں:

> ”اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد کس سال پڑی مگر میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے عمر کی چالیسویں سال میں خانقاہ کی تعمیر ہوئی ہوگی اور یہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو تادمِ تحریر اس کو بنے ہوئے تین سو برس ہوتے ہیں۔ بہر حال شیخ محمد رشید قدس سرہ نے راجی سید مجتبیٰ سجادہ نشین خانقاہ مخدوم شیخ حسام الحق مانک پور کے حکم سے اور تمام قبائل موضع برونہ سے چلے آئے۔ انہوں نے خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی، کنواں کھدوایا، مسجد پہلے مسطح تھی بعد کو گنبدی بنی اور خانقاہ پہلے پوش نہ تھی اس پر چھپر پڑا تھا، چنانچہ اس نقل سے ظاہر ہے کہ قطب الاقطاب خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور پانی برس رہا تھا، چھپر ٹپکا تو کسی نے عرض کیا کہ چھپر خوب نہیں بنا، جس سے پانی رکتا، انہوں نے فرمایا کہ چھپر پانی کو روکنے کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ دھوپ کو روکنے کے لیے، کیونکہ بارش کا زمانہ صرف چار مہینہ ہے، اس میں بھی اول آخر میں پانی کم برستا ہے۔ کچھ دن، رات

www.shibliacademy.org

پانی نہیں برستا، اگر حساب کیا جائے تو بارش کا زمانہ کل پندرہ سولہ روز ہی ہوگا پس عاقل کا کام نہیں کہ اتنے دن کے لیے گھر بنائے، ہاں آفتاب ہمیشہ رہتا ہے، گھر اس کے لیے ہونا چاہیے"۔ (سمات الاخیار، ص ۴۳، ۴۴)

بانی سلسلۂ رشیدیہ کی سیرت: شیخ محمد رشید ایک متبحر عالم، عارف باللہ اور زبردست صاحب تصوف بزرگ تھے۔ آپ سے مدعائے دل ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا لفظ زبان پر جاری رکھتے۔ قناعت اور استغنا آپ کے مزاج میں ہی داخل تھا۔ سلاطین اور امرا کے دروازے پر جانا پسند نہ تھا۔ جس کام کو شروع کرتے اس کو پورا کرتے۔ کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ نہ فرماتے۔ تہذیب وادب کا لحاظ رکھتے۔ ہر کام میں بزرگوں کی پیروی کرتے۔ مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم دیتے اور اس کی پابندی کا حکم فرماتے۔ بیمار ہوتے تو بہت کم دوا لیتے اور فرماتے کہ دوا میں توکل اچھی چیز ہے اور دوا کرنے کا حکم بھی ہے۔ سماع سے آپ کو انکار نہ تھا۔ آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے تھے۔ اگر کوئی ناواقف غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل فرماتے۔ مثلاً ایک مرتبہ حاجی جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، انہوں نے فرمایا کہ میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل درپیش آتی ہے، کیونکہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے حسن ظن کا حکم دیا ہے۔ لامحالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کو رمضان میں سر بازار کھاتے ہوئے دیکھوں تو گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبے سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ اگر کسی کو ننگے بدن اس طور سے نماز پڑھتا ہوا دیکھوں کہ عورت غلیظہ چھپا ہوا ہو، تو سمجھوں گا کہ مالکی المذہب ہے۔ اگر کسی کو دیکھوں کہ وضو کے بعد بلا تجدید وضو نماز پڑھ رہا ہے تو خیال کروں گا کہ شافعی المذہب ہے۔ اگر کسی کو جانوں کہ اس نے شراب پی ہے، کہوں گا توبہ کر لی ہوگی۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حاکم شہر ظالم اور رافضی ہے مگر نماز عید اس نے جماعت سے پڑھی تھی، فرمایا کہ جب تم نے نماز جماعت سے پڑھتے ہوئے دیکھا پھر کیوں اس کے حق میں برا گمان کیا، انسان کو نیکی پر نظر کرنی چاہیے نہ کہ بدی پر۔ (سمات الاخیار، ص ۸۲، ۸۳)

اقوال زریں: مورخین نے ان کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے اقوال وعادات اور اطوار کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ یہاں سب کی گنجائش تو نہیں، ذیل میں چند اقوال قلم بند کیے جاتے ہیں:

www.shibliacademy.org

۱۔ سالک کو چاہیے کہ وہ صف نعال میں بیٹھے تاکہ اپنے کو پستی میں دیکھ کر بلندی کی طرف ترقی کرے اور شیخ کو چاہیے کہ صدر میں بیٹھے تاکہ نعال نشینوں کی طرف متوجہ ہو اور ان کی تعلیم اور ترقی کی کوشش کرے۔ ۲۔ طلب کامل وہی ہے جو اپنی زبان سے کہنے کی نوبت نہ آئے اور شیخ خود اس کی عرضی کی طرف توجہ کرے۔ ۳۔ دنیا والے چاہتے ہیں کہ فقرا کو ایک دو ملاقات میں پہچان لیں، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ فقیر کو غیر فقیر پہچان لے۔ ۴۔ کل سر جاوز الاثنین شاع اس حدیث میں اثنین سے مراد دو آدمی نہیں ہیں بلکہ دولب ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ بھید جب دولب سے گزر جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ (سمات الاخبار، ص ۸۸ تا ۹۰)

نکاح واولاد: ۱۰۳۲ھ میں حاجی ارزانی فاروقی کی نیک بخت صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ سال تھی، جن سے چار فرزند ہوئے۔ ۱۔ شیخ محمد حمید، ۲۔ شیخ محمد ارشد، ۳۔ شیخ غلام معین الدین، ۴۔ شیخ غلام قطب الدین۔ ان میں سے ہر ایک علوم ظاہر و باطن سے بہرہ مند تھے۔ شیخ محمد ارشد ملقب بہ بدرالحق، جن کو ہر امر میں ترجیح حاصل تھی، اکابر سلسلہ کے اتفاق سے والد کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔ (سمات الاخیار، ص: ۹۳ ملخصاً)

وفات: شعبان کے آخر سے بخار آنا شروع ہوا اور روز بروز مرض بڑھتا گیا، طاقت گھٹتی گئی۔ اس کے باوجود معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ نماز باجماعت ادا کرتے، رمضان کی آٹھویں تاریخ کو ظہر کے وقت انہوں نے وضو کیا، تخت پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، عصر کے وقت اتنی قوت نہ رہی کہ تخت پر جاتے، ناچار تیمم کرکے پلنگ پر نماز پڑھی، مغرب و عشا بھی اسی پلنگ پر ادا کی، رات کو حالت متغیر ہوتی رہی، کرب زائد تھا مگر آدھی رات کے بعد تیمم کا ظرف طلب کیا، تیمم فرمایا، تہجد اور ذکر و اذکار کیا، فجر کی نماز ادا کی پھر پلنگ پر لیٹ گئے، جب لوگوں نے دیکھا تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ یہ جمعہ کا دن، رمضان کی نویں تاریخ، ۱۰۸۳ھ کا سال تھا۔ خاص باغ میں جو اس وقت درگاہ کا احاطہ ہے، مدفون ہوئے۔ شیخ محمد ماہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور شیخ محمد ارشد و ملا ملتانی کے ساتھ قبر میں بھی اترے۔ پہلے بیر کے تخت دیے گئے، پھر وصیت کے مطابق ان پتھروں کا تختہ دیا گیا، جن پر طلبہ و تلامذہ کی جوتیاں اترتی تھیں۔ (سمات الاخیار، ص ۹۹، ۱۰۰)

خلفا پر ایک نظر: سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ یوں تو ان کے خلفا کی تعداد بہت

www.shibliacademy.org

ہے، مگر ۳۴ خلفا ایسے کامل اور جید عالم تھے کہ ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے۔طوالت کے خیال سے صرف ان کی فہرست دی جاتی ہے:

شیخ عبدالمجید قدس سرہ، ملاعبدالشکور منیری قدس سرہ، شیخ مبارک محی الدین قدس سرہ، مولانا نورالدین مداری جون پوری قدس سرہ، شیخ آیت اللہ قدس سرہ، نصرت جمال ملتانی جامعی گنج رشیدی قدس سرہ، شیخ محب اللہ قدس سرہ، شیخ عبداللہ مٹھن پوری قدس سرہ، شیخ ہارون رشید قدس سرہ پوردیوہ، میر محمد صادق قدس سرہ جون پوری، سید محی الدین قدس سرہ محمد آبادی، حاجی شیخ جلال الدین قدس سرہ جون پوری، ملامحمد نعیم قدس سرہ مدوسرائے، شیخ عبدالحی قدس سرہ فتح پور ہسوہ، شیخ مرتضیٰ پسر شیخ عبدالمجید قدس سرھما، میر سید نور قدس سرہ پٹنوی، شیخ عبداللہ قدس سرہ بنگالی، شیخ عبدالواحد مشتاق قدس سرہ فتح پوری، شیخ حبیب اللہ قدس سرہ بہاری، میر سید سیف الدین قدس سرہ مدن پوری، شیخ ضیاء الدین قدس سرہ خویشگی، میر سید نور قدس سرہ شہر پورنیہ، میر محمد غوث قدس سرہ موضع مندول، قاضی محمد مودود قدس سرہ جون پوری پسر قاضی محمد حسین قاضی شہر، راجی صدرالدین قدس سرہ خویش، راجی خضر قدس سرہ مانک پوری، شیخ غلام محی الدین متوکل قدس سرہ جون پوری، شیخ محمد نصیب منیری قدس سرہ، میر سید محمد اسماعیل قدس سرہ سیوانی، حضرت سید محمد ارشد رشید قدس سرہ۔ یہ سب بزرگ اہل کمال، عارف کامل اور ذاکر وشاغل تھے۔(سمات الاخیار، ص:۱۰۱ تا ۱۰۴)

ان کے علاوہ تین اور اولوالعزم خلفا یہ ہیں:

میر سید قیام الدین قدس سرہ گورکھپوری، میر سید محمد جعفر قدس سرہ پٹنوی، شیخ یٰسین قدس سرہ جھونسوی۔ان میں سے بعض کا اجمالی تذکرہ آیندہ صفحات میں قلم بند کیا جائے گا۔

دعوتی خدمات: سلسلہ رشیدیہ کو جاری ہوئے تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا، مگر آج بھی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔مخلوق خدا کی خدمت اور رشد وہدایت کا کام بحسن وخوبی انجام پارہا ہے۔اس سلسلے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادۂ میراثی نہیں ہے۔پورے سلسلے میں جو اولوالعزم علما ومشائخ اور صالحین ہوں گے وہ اتفاق رائے سے سلسلے کے کسی فرد کو جو اجازت اور خلافت یافتہ ہوگا، اس کو سجادہ کے لیے منتخب کرتے ہیں۔یہ طریقہ منہاج نبوت وخلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق ہے۔دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جو اس سلسلہ کا سجادہ ہوگا، اس کے ذمہ اس

www.shibliacademy.org

سلسلے کی فقط ایک خانقاہ کی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس کی اور خانقاہوں کی مکمل ذمہ داری ادا کرنا اس کا دینی اور روحانی فریضہ ہے۔ایک خوبی کی بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سجادہ خانقاہی فرائض اور دینی اور روحانی ذمہ داریوں اور خدمت خلق سے لاتعلقی کا ثبوت دیتا ہے،تو اصحاب حل وعقد نے جس طرح ان کو منتخب کیا تھا،اسی طرح ان کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس عہدہ کے لیے منتخب کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں۔آج جب کہ ہم زمانۂ نبوت سے چودہ سو سال دور ہو چکے ہیں، یہ خانقاہ اپنی مثال آپ ہے۔دوسری تمام خانقاہوں کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

شیخ محمد رشید نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ ورسولؐ کی رضا کے مطابق دعوت وتبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام قائم کیا تھا، وہ آج بھی قائم ہے اور خلفا اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت و تبلیغ، رشد وہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں۔انہوں نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ جاری ہے اور اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ان خانقاہوں کے ذریعے مخلوق خدا کی علمی اور روحانی سیرابی کا سامان فراہم کیا جارہا ہے۔اس کے خلفا اور پھر ان کے خلفا کا جو ایک لمبا سلسلہ چل رہا ہے،ان تمام کا سہرا شیخ محمد رشید قدس سرہ کے سر جاتا ہے۔

بانی سلسلہ رشیدیہ کی علمی خدمات: حضرت شیخ کی ذات علمی دنیا میں نہ کل محتاج تعارف تھی اور نہ آج۔وہ اپنے دور کے عالموں اور محققین پر سبقت لے گئے۔ہم عصر علما ومشائخ نے جہاں ان کی روحانی حیثیت کو تسلیم کیا وہیں ان کی علمی قدر و قیمت کو بھی سراہا ہے(۳)۔اساتذہ نے بھی ان پر فخر کیا ہے۔صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے عالم ان کے ہم سبق اور ملا موہن بہاری مداحوں میں شامل ہیں۔اپنے اساتذہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے گھر کے در و دیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ہمیشہ طالبان علوم نبویہ کو درس دیا کرتے تھے اور ان کی قدر کیا کرتے تھے، حتی کہ وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ جس پتھر پہ طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں، میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے۔(سمات الاخیار،ص ۶۵)

حسب معمول استاذ العلما شیخ محمد افضل کی خدمت میں تشریف لے گئے، وہ علم مناظرہ کی کتاب شریفیہ کسی کو پڑھا رہے تھے،ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھے تو اچھی ہوگی۔دوسرے ہفتہ میں جب ملنے گئے تو شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر لے گئے۔استاذ العلما

www.shibliacademy.org

نے دیکھ کر بہت پسند فرمایا۔ یہ شرح ایسی جامع ومانع اور سلیس واقع ہوئی ہے کہ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا اور کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ (سمات الاخیار، ص ۶۵)

جس طرح ان کی تصانیف کی کثرت ہے، اس سے کئی گنا زیادہ جید تلامذہ کی تعداد ہے۔ تلامذہ میں سے اکثر نے انہی سے طریقت میں بھی اجازت وخلافت حاصل کی یا کم از کم ان کے مرید ہوئے۔

تصانیف: صاحب سمات الاخیار کے مطابق چند کتابیں جو خانقاہ میں موجود ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

رشیدیہ: یہ شریفیہ کی شرح اور فن مناظرہ پر مشہور کتاب ہے، یہ چھپ گئی ہے اور داخل درس ہے۔

تذکرۃ النحو: نحوی مسائل پہ چند اوراق کا رسالہ ہے، جس کو انہوں نے اپنے صاحبزادے شیخ محمد ارشد کے لیے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا میں اعلم ارشدک اللہ تعالیٰ لکھا ہے۔ اب خلاصۃ النحو کے نام سے مشہور ہے اور نحو میر کے آخر میں طبع ہے۔

زاد السالکین: یہ تصوف سے متعلق ہے، جس کو انہوں نے اپنے پہلے مرید شیخ عبد المجید کے لیے تحریر فرمایا ہے۔

مقصود الطالبین: یہ بھی تصوف میں ہے۔ اس میں معارف اور حقائق کی باتیں مرقوم ہیں۔ نصرت جمال ملتانی کے لیے لکھی گئی تھی۔

ترجمہ معینیہ: یہ رسالہ تذکرۃ النحو کی شرح ہے، شیخ غلام معین الدین کے لیے تحریر کیا تھا۔

بدایۃ النحو: یہ بھی نحوی رسالہ ہے، جس کو اپنے بیٹے شیخ محمد حمید کے لیے لکھا تھا۔

مکتوبات: ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو خلفا کے نام بطور جواب کے لکھے تھے۔

دیوان شمسی: فارسی وہندی اشعار کا مجموعہ ہے، شمسی تخلص تھا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شیخ اکبر کی تصنیف اسرار الخلوقات پر ایک بسیط شرح لکھی ہے۔ رشیدیہ اور تذکرۃ النحو کے سوا سب رسالے قلمی ہیں، اب تک چھپے نہیں۔

سلسلۂ رشیدیہ کے سجادگان ایک نظر میں: شیخ محمد ارشد جون پوری۔ شیخ قمر الحق غلام رشید۔ حیدر بخش امام الدین۔ شاہ امیر الدین۔ شاہ غلام معین الدین۔ شاہ سراج الدین۔ محمد عبد العلیم

www.shibliacademy.org

آسی غازی پوری۔ شاہ شاہد علی سبز پوش۔ شاہ مصطفی علی سبز پوش۔ شاہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی۔

سلسلۂ رشیدیہ کی سجادگی کے تحت آباد خانقاہیں: خانقاہ رشیدیہ، جون پور۔ خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڈیہہ، بنارس۔ خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار۔ خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان، بہار۔ خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور۔

سلسلہ رشیدیہ کے ممتاز علما و مشائخ: شیخ محمد رشید قدس سرہ جہاں علمی اعتبار سے مرجع خلائق تھے وہیں دوسری طرف طریقت، حقیقت اور معرفت کے لحاظ سے اپنے دور کے شیخ المشائخ تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے اپنی علمی اور روحانی تشنگی دور کی، تلامذہ اور خلفا کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔ ۳۴ خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی خلفا تھے، جن کا ذکر نہیں ملتا۔ اس سلسلے کے بعض اولوالعزم خلفا اور مشائخ کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

میر سید قیام الدین گورکھپوری قدس سرہ (م ۸/صفر ۱۱۲۸ھ): اصل وطن سگڑی اعظم گڑھ تھا۔ بعد میں انہوں نے گورکھپور کو شرف بخشا۔ شیخ محمد رشید قدس سرہ سے ارادت و خلافت دونوں حاصل تھی۔ وہ زاہد، صائم الدہر، قائم اللیل درویش تھے۔ ان کے بارے میں مرشد گرامی نے فرمایا: ''تم اور سید محمد جعفر کل اس فقیر کی نجات کے سبب ہوگے''۔ خاندان میں سجادگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ شاہ شاہد علی سبز پوش قدس سرہ کے وہ مورث اعلیٰ ہیں۔

شیخ محمد ارشد قدس سرہ (پ ۱۰۴۱ھ): نام محمد ارشد، کنیت ابوالکشف اور لقب بدرالحق تھا۔ وہ قطب الاقطاب شیخ محمد رشید بانی رشیدیہ کے منجھلے صاحبزادے اور سلسلۂ رشیدیہ کے پہلے سجادہ تھے۔ انہوں نے علوم شرعیہ متداولہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الہداد جون پوری، ملانورالدین مداری جونپوری اور اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولید اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی، جبکہ کتب تصوف کا علم اپنے والد گرامی سے حاصل کیا۔ ۲۱/سال کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہوئے، پھر طالبان علوم نبویہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ ۲۲/سال کی عمر میں اپنے والد کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوئے اور انہی سے اجازت و خلافت بھی حاصل کی۔ اپنے والد ہی کی طرح جواں مرد اور باہمت تھے۔ خاندانی نعمتوں کے حصول کے بعد مزید کوشش جاری رہی۔ شیخ عبداللطیف مٹھن پوری جو سید الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہ کی اولاد سے تھے اور سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ میں صاحب اجازت و

www.shibliacademy.org

خلافت تھے۔ شیخ محمد ارشد کے خسر ہوئے۔ شادی کے بعد ان دونوں سلسلوں کی اجازت وخلافت بھی حاصل کی۔ قطب الاقطاب کے قابل فخر فرزند اور جانشین تھے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں کسی بزرگ نے قطب الاقطاب سے پوچھا کہ دوست جب دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ ہدیہ لے کر جاتا ہے۔ جب خدا کے سامنے جائیں گے اگر خدا نے پوچھا کہ میرے واسطے کیا ہدیہ لائے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ اس پر وہ آب دیدہ ہوئے اور فرمایا ''دست محمد ارشد گرفتہ پیش خواہم کرد کہ ہمیں راہدیہ آوردہ ام''۔ (سمات الاخیار، ص ۱۱۸، ۱۱۹)

شیخ محمد ارشد بدرالحق ایک بار دہلی کے سفر پر تھے، لکھنؤ کے قریب سے گزر رہے تھے تو شاہ عبدالرزاق بانسوی نے حاضرین سے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور بدرالحق نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات میں خدا کے دوست کی بو آرہی ہے۔ (سمات الاخیار، ص ۱۲۴، بحوالہ بحر زخار)

طبیعت میں موزونیت تھی، شاعری کا ذوق رکھتے، چند اشعار بھی ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اپنا تخلص ''والہ'' کرتے تھے۔ یہ اشعار ان کی قادرالکلامی کی شہادت ہیں:

رخ او بے نقاب باید دید روز را آفتاب باید دید
لب لعل تو با پیالہ مدام مست را با شراب باید دید
والہا غیر او مبیں ہر گز آب را با حباب باید دید

(سمات الاخیار، ص ۱۲۸، ۱۲۹)

اولاد: شیخ محمد ارشد نے دو شادیاں کیں۔ پہلی ۱۰۶۲ھ میں شیخ مبارک محی الدین ابن نوراللہ انصاری ہروی کی صاحبزادی سے، جن سے دو لڑکے ہوئے، ایک شیخ نوراللہ اور دوسرے شیخ ثناءاللہ۔ دوسری شیخ عبداللطیف مٹھن پوری کی صاحبزادی سے ہوئی، ان سے بھی دو لڑکے ہوئے، ایک شیخ محب اللہ اور دوسرے شیخ محمد۔ (سمات الاخیار، ص ۱۳۰)

خلفا و مریدین: سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ۲۹۷۱/افراد نے ان سے بیعت کی اور تیس نفوس قدسیہ نے ان سے روحانی سلسلوں کی اجازت وخلافت حاصل کی۔ ذیل میں بعض

www.shibliacademy.org

ممتاز خلفا کا مختصراً ذکر کیا جارہا ہے:

میر سید محمد باقر پٹنوی (پ ۱۷ ربیع الآخر ۱۰۷۲ھ، م ۷ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۸ھ): میر سید جعفر پٹنوی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اپنے والد ہی سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے۔ بعد میں محمد ارشد کی بارگاہ میں سلوک کی تکمیل کی اور تمام عمر درس وتدریس، ہدایت خلق اور ارشاد فقرا میں مشغول رہے۔ وہ اپنے شیخ اجازت وخلافت سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے چند ہی سال بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا اور پٹنہ محلہ شریعت آباد میں اپنے والد کے روضہ میں مدفون ہوئے۔ (سمات الاخیار، ص ۱۳۸، ۱۳۹)

میر سید محمد اسلم پٹنوی (م ۲۱ شوال ۱۱۳۸ھ): لقب عبدالقدوس تھا۔ میر سید محمد جعفر کے منجھلے بیٹے تھے۔ علوم متداولہ کے علاوہ اجازت وخلافت بھی اپنے والد ہی سے حاصل کی اور پھر شیخ محمد ارشد بدرالحق سے مزید نعمتیں میسر آئیں۔ ساری عمر مخلوق خدا کی رشد وہدایت اور طالبان علوم نبویہ کے درس و تدریس میں صرف کردی۔ انہوں نے رسالہ عمدۃ النجاۃ فی حل الزلات تحریر فرمایا۔ (سمات الاخیار، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱)

میر سید سعداللہ (م ۱۲ رجب المرجب ۱۱۱۷ھ): یہ بہار ضلع سارنگ کے رہنے والے اور بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے مرید اور خادم خاص تھے۔ شیخ محمد ارشد سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ ان کا مزار پسونڈ میں ہے۔ (سمات الاخیار، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳)

مختصر یہ ہے کہ شیخ محمد ارشد بدرالحق نے اپنے والد سے جن نعمتوں کو پایا تھا، ان میں اضافہ بھی کیا اور دعوت وارشاد کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا، اس کو مزید وسیع پیمانے پر جاری رکھتے ہوئے خدمت خلق اور تزکیۂ نفوس کی غرض سے مریدین اور خلفا کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔

سید محمد جعفر پٹنوی (م ۳ رمضان ۱۱۰۵ھ): نام محمد جعفر اور لقب بحر الحقائق نجم الحق تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ جب آٹھ برس کے تھے تو ان کے والد سید ابوالحسن نے وفات پائی۔ دادا نے پرورش کی اور سلسلۂ چشتیہ میں مرید کرکے خرقۂ خلافت دے کر اپنا جانشین بنایا۔ سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علوم کے لیے جون پور آئے اور قطب الاقطاب (شیخ محمد رشید) کے مدرسہ میں مقیم ہوئے۔ تکملۂ علوم کے بعد چونکہ پہلی بیعت صغرسنی کی وجہ سے ٹھیک یاد نہ تھی،

www.shibliacademy.org

سلسلۂ قادریہ میں مرید ہوگئے اور چند دن خدمت میں رہ کر مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ اس کے علاوہ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ و مداریہ کی بھی خلافت واجازت حاصل کی اور بحکم شیخ پٹنہ میں قیام کیا۔ ایک مدت تک مجرد رہے اور ایک مسجد میں بسر کی۔ جب ان کی عمر زیادہ گزر گئی تو ان کی والدہ کی تحریک سے قطب الاقطاب نے انہیں سنت نبویؐ کے اتباع پر مجبور کیا اور خود ہی میر سید نورالدین نبیرۂ سید فضل اللہ عرف سید گوشائیں داماد قطب بینادل قلندر کی صاحبزادی سے نسبت مقرر کر کے شادی کرادی۔ پھر وہ مادرزاد ولی پیدا ہوئے۔ عالم، عامل اور عارف کامل تھے۔ طریقۂ نبویؐ ہر امر میں ملحوظ رہتا۔

کسی نے پوچھا کہ آپ کے پیر، سماع سنتے ہیں، آپ کیوں نہیں سنتے؟ جواب دیا کہ پیر نے رخصت کے وقت فرمایا تھا کہ حضرت امام اعظم کی فقہ پر عمل کرنا، میں پیر کی اطاعت کو سعادت دارین جانتا ہوں۔ ان کا قول مشہور ہے "میں نے رشید (خدا) کو رشید کے سبب سے پہچانا۔ اگر رشید نہ ہوتے تو میں خدا کو نہ پہچانتا"۔ ان کا مرتبہ اسی سے روشن ہے کہ ایک بار قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ "قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹنوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے"۔

انہوں نے کل تبرکات وخرقۂ خلافت اپنے بیٹوں میر محمد باقر و میر محمد اسلم میں تقسیم کر دیے۔ صرف ایک رومال رکھ لیا اور وصیت کی کہ کفناتے وقت اس رومال کو میرے سر پر باندھ دینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ کی تیسری تاریخ کو پنج شنبہ کے روز انتقال اور شریعت آباد بیرون شہر پٹنہ میں مدفون ہوئے۔ گزراوقات کے لیے ایک مرید نے ایک موضع دینا چاہا تھا، مگر قبول نہ فرمایا۔ اس کے اصرار پر چند بیگھہ زمین لے لی اور اس کا نام شریعت آباد رکھا۔ (سمات الاخیار، ص ۱۰۷ تا ۱۰۹)

شیخ یٰسین جھونسوی (تاریخ وفات معلوم نہیں): شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ عبدالرحیم بن بندگی شیخ اوجھڑ صدیقی جون پوری کے بیٹے تھے۔ چونکہ سعید ازلی تھے اس وجہ سے ان کو بچپن ہی سے مخدوم طیب بنارسی کی صحبت نصیب ہوئی۔ مخدوم بنارسی نے ان کی پرورش اور تعلیم مربیانہ فرمائی۔ گیارہویں برس سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے اپنا خلیفہ بنایا۔ شہاب الدین دولت آبادی ثم جون پوری کا رسالہ نحو ارشاد پڑھایا، پھر جون پور بھیجا۔ استاذ العلما شیخ افضل اللہ آبادی اور قطب الاقطاب شیخ محمد رشید سے کتابیں پڑھیں، سات برس تک جون پور میں رہے، درمیان میں وقتاً فوقتاً مخدوم کی زیارت سے فیض یاب بھی

www.shibliacademy.org

ہوتے رہتے۔ بیسویں برس جمیع سلاسل کے خرقے اور خلافتیں حضرت مخدوم نے عطا کیے۔ مخدوم کے بعد جو کسر رہ گئی تھی دیوان جی شیخ محمد رشید نے پوری کردی اور خلافت واجازت بخشی۔ ان باتوں کے با وجود دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدم بوس ہونا چاہتے تھے تو یہ بھی اپنا ہاتھ ان کے پاؤں تک ضرور پہنچاتے تھے۔ کشف کی حالت بہت طاری رہا کرتی، تصوف کے بہت سے مشکل مسائل بذریعۂ تحریر پوچھے ہیں اور دیوان جی نے ان کے جواب میں مکتوب لکھے ہیں۔ اپنے پیران سلاسل کے حالات میں مناقب العارفین ان کی عمدہ تصنیف ہے۔ سال وفات معلوم نہیں آپ کا مزار قصبہ جھونسی، الٰہ آباد میں شیخ نصیر الدین اسد العلما کے روضے کے اندر ہے۔ (سمات الاخیار، ص: ۱۱۱/ ۱۱۲)

شیخ غلام رشید (پ ۸/ربیع الاول ۱۰۹۶ھ/م ۵/صفر ۱۱۶۷ھ): غلام رشید نام، کنیت ابوالفیاض اور لقب قمر الحق تھا۔ شیخ محب اللہ کے لڑکے اور شیخ محمد ارشد کے پوتے وجانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے دوسرے سجادہ نشین تھے۔ چودہ دن کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور ایک سال چار ماہ کے ہوئے کہ والد کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ دادا شیخ محمد ارشد نے پرورش کی اور کامل ومکمل بنا دیا۔ علوم ظاہرہ متداولہ مختلف علمائے وقت سے حاصل کیے اور تکمیل اپنے دادا شیخ محمد ارشد سے ہی کی۔ دعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں اپنی عمر عزیز صرف کردی۔ شیخ حیدر بخش نواسے تھے، جن کی تعلیم کے لیے انہوں نے رسالہ ''درایۃ النحو'' کی نہایت بسیط شرح لکھی۔ وہ متبحر عالم اور کامل درویش ہونے کے ساتھ زود گو شاعر بھی تھے۔ فارسی کلام بھی ملتا ہے۔

پٹنہ کے سفر میں جب خانقاہ جعفریہ میں وہ مقیم تھے تو ملاقات کی غرض سے خانقاہ مجیبیہ کے بانی حضرت مجیب اللہ پھلواروی تشریف لائے اور خانقاہ میں حاضری کی دعوت دی۔ وہ تشریف لے گئے۔ پٹنہ سے پورنیہ گئے اور پھر طبیعت خراب ہوئی، اسی سفر میں انتقال بھی ہوگیا، وصیت کے مطابق خانقاہ رشیدیہ جونپور میں دفن کیا گیا، کثرت سے ان کی کرامتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (سمات الاخیار، ص ۱۴۴ تا ۱۶۲)

خلق خدا نے کثرت سے ان کے دست مبارک پر توبہ کیا۔ مخلوق خدا کی اصلاح، تزکیۂ قلوب اور تصفیہ نفوس کے لیے انہوں نے چالیس سے زائد نفوس قدسیہ کو روحانی نعمتوں کی اجازت وخلافت سے سرفراز فرما کر رشد وہدایت کا بہتر انتظام فرمادیا (سمات الاخیار، ص ۱۶۳)

www.shibliacademy.org

شاہ حیدر بخش (وفات ۲۵ رشوال ۱۲۲۴ھ): ان کا نام حیدر بخش، لقب نورالحق اور قطب الدین ہے۔ محبوب الحق شاہ فصیح الدین کے لڑکے اور قمرالحق غلام رشید کے نواسے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ تھے۔ نسبی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ پانچ بھائی تھے۔ ۱۱۶۳ھ میں اپنے نانا کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے۔ وہیں تعلیم و تلقین اور تکمیل نانا کے ہاتھوں ہوئی، نانا کے بعد بھی انہوں نے اپنے والد سے مزید فیض حاصل کیا۔ شادی دو کی تھی۔ پہلی سے نجیب الدین اور دوسری سے شاہ امیر الدین پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ اردو زبان میں چند اشعار ملتے ہیں۔

سیوان، بہار کا اکثر سفر کرتے اور مہینوں قیام فرماتے۔ بہمن برہ نامی گاؤں میں انہوں نے خانقاہ اور مسجد بنوائی تھی۔ ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر ۲۵ رشوال ۱۲۲۴ھ کو سیوان ہی میں وفات پائی اور یہیں دفن بھی ہوئے۔ اس مقام کو تکیۂ حیدری کہا جاتا ہے۔ (سمات الاخیار، ص ۱۷۸ تا ۱۸۲)

ان کے بعد صاحبزادے شاہ امیر الدین صاحب سجادہ ہوئے اور سلسلۂ رشیدیہ کے دعوتی و علمی اور رفاہی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ شاہ امیر الدین کے علاوہ آپ کے ۱۲ رخلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان ۱۲ رکے علاوہ بھی خلفا کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

شیخ قیام الحق شاہ امیر الدین (وفات ۹ رمحرم الحرام ۱۲۲۵ھ): نام امیر الدین اور لقب قیام الحق۔ شاہ حیدر بخش کے چھوٹے لڑکے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے چوتھے سجادہ نشیں تھے۔ اپنے والد سے سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے اور تمام سلاسل کی اجازت و خلافت اور خاندانی فیوض و برکات سے شرف یاب ہوئے۔ متانت، وقار، توکل اور قناعت بے حد تھی۔ دنیا کی باتوں سے زبان کو بچانے کے لیے بہت کم بولتے تھے اور بلا ضرورت کبھی زبان نہیں کھولتے تھے۔ اگر کبھی تکلیف تکلم گوارا فرماتے تو پیران سلاسل کا ذکر زبان پر لاتے۔ اپنے خاندانی بزرگوں کی طرح برابر درس و تدریس اور بندگان خدا کی ہدایت و تعلیم میں اپنے اوقات صرف کیے۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی، دوسری سے شاہ ولی بخش اور دو بیٹیاں ہوئیں اور تیسری بیوی سے شاہ معین الدین قطب الہند اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئی۔ (سمات الاخیار، ص ۱۸۷، ۱۸۸)

کثرت سے کرامات کا تذکرہ ملتا ہے۔ مریدین و متوسلین دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

www.shibliacademy.org

سمات الاخیار کے مصنف لکھتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابوالعلائی یوسف پوری جو اپنے وقت کے ایک جلیل القدر بزرگ تھے، جنھوں نے ہند سے عرب تک کی سیاحت اور تمام متبرک مقامات کی زیارت کی تھی، عرب میں ایک بزرگ سے ملے جو نہایت مشغولی اور استغراقی حالت میں تھے۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ ایسے بزرگ اس زمانے میں بھی موجود ہیں۔ پوچھا کس کے مرید ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے باپ کے مرید ہیں۔ پھر پوچھا کہ ان کے شیخ کون ہیں؟ جواب دیا کہ شاہ امیر الدین جون پوری جو ملک ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ (سمات الاخیار، ص ۱۹۰) ۹/محرم الحرام ۱۲۲۵ھ کو ان کی وفات ہوئی اور رشید آباد میں مدفون ہوئے۔

مریدین اور خلفا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض خلفا کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں سے چند کے اسما یہ ہیں: شاہ غلام معین الدین، ان کے صاحبزادے اور جانشین بھی تھے۔ شیخ قنبر حسین سکندر پوری، یہ شاہ معین الدین کے ہم عمر اور شاہ قیام الحق کے مرید و خلیفہ ہونے کے ساتھ سکندر پور کے رئیس اور شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری کے والد تھے۔ ۱۰/محرم الحرام ۱۲۸۰ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شاہ رشید الحق میر سید حسین علی جعفری (۱۲۲۶ھ/ ۱۶/رجب ۱۳۰۳ھ)، مولوی سید جعفر علی کے بیٹے اور اپنے حقیقی چچا فیاض الحق سید سجاد علی کے مرید و خلیفہ اور سجادہ نشین تھے۔ شاہ قیام الحق سے بھی مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ قطب الہند شاہ غلام معین الدین سے بھی اجازت و خلافت رکھتے تھے۔ سمات الاخیار کے مصنف نے ان تین کے علاوہ چار اور خلفا کا بھی ذکر کیا ہے۔

شاہ غلام معین الدین امیری (وفات ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ): ان کا نام غلام معین الدین، کنیت ابوالخیر اور لقب قطب الہند تھا۔ قیام الحق کے چھوٹے لڑکے، مرید و خلیفہ، جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے پانچویں سجادہ تھے۔ والد سے مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت کے علاوہ شیخ بدرالدین بدر عالم زاہدی سے سلسلۂ زاہدیہ کی بطریق اویسیہ اجازت و خلافت رکھتے تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے مکہ شریف کا سفر کیا تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی چشتی صابری نے ان سے ملاقات کی اور جو کچھ مطلوب و مقدر تھا لے گئے۔ دوسرے دن جب دوبارہ تشریف لائے تو اپنا ایک رسالہ مع اجازت نامہ کے دے گئے۔

www.shibliacademy.org

صاحب سمات الاخیار نے لکھا ہے کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابوالعلائی یوسف پوری جو بڑے سیاح اور مشائخ کی صحبت اٹھائے ہوئے درویش تھے، ان کا بیان ہے کہ ہند سے عرب تک میں نے اس جامعیت کا شیخ کہیں نہیں پایا۔ کسی نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ شاہ معین الدین اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی میں کیا نسبت ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مولانا کی مثال اس شخص کی ہے جس نے بذات خاص ایک دولت پیدا کی ہو اور شاہ صاحب کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے خود بنفس نفیس بھی دولت پیدا کی ہو اور اس کو اپنے باپ دادا کئی پشتوں کی دولت بھی ہاتھ لگی ہو۔ ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ کا دن قیامت ڈھانے والا تھا۔ اسی شام مغرب کی فرض اور سنت نماز کے درمیان طالب مطلوب سے، عاشق معشوق سے جاملا۔ (سمات الاخیار، ص ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۳۳)

(باقی)

کتابیات

(۱) سمات الاخیار، مولوی محمد عبدالمجید و سید محمد اصغر ایوبی، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی۔ مطبع جمیل برادرز، لیاقت آباد، کراچی، ۱۴۱۹ھ۔

(۲) دیوان فانی، سید مصطفی علی رشیدی، ناشر، انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ۔

(۳) مناقب العارفین، شیخ یٰسین جھونسوی، مترجم ناشر: خانقاہ رشیدیہ جون پور شریف۔

(۴) عین المعارف، مولف شاہ شاہد علی رشیدی، ناشر: انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ۔

(۵) انوار الاولیا، مولف مولوی حبیب اللہ مختار، خرم پرنٹنگ پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء۔

(۶) ماہ نامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۰۱۲ء۔

(۷) تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمٰن علی، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، ۱۹۱۴ء۔

(۸) حدائق الحنفیہ، مولوی فقیر محمد جہلمی، مکتبہ رضویہ، دہلی، ۲۰۰۶ء۔

(۹) نزہۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی، مکتبہ دارعرفات، دائرہ الشیخ علم اللہ، رائے بریلی، ۱۹۹۲ء۔

(۱۰) مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم: یونس رضا اویسی، جامعۃ الرضا، بریلی، ۲۰۰۸ء۔

(۱۱) خطبات رشیدیہ، مفتی عبید الرحمٰن رشیدی، مکتبہ آسی، بلیا، ۱۴۱۴ھ۔

www.shibliacademy.org

شادؔ عظیم آبادی کی شعری خصوصیات

ڈاکٹر محمد زبیر

اردو ادب میں دبستانوں کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ یہ دبستان نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں اہم اور کارگر ثابت ہوئے ہیں بلکہ ادبی اور علاقائی سطح پر ایک منفرد شناخت بھی رکھتے ہیں۔ ان دبستانوں میں دہلی و لکھنؤ کے بعد دبستان عظیم آباد بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں اردو ادب کے متعدد دانشوروں اور باکمال شخصیتوں کا حصہ ہے۔ انہیں باکمالوں میں ایک نام شاد عظیم آبادی کا بھی ہے جن کی اعلیٰ و ارفع شاعری کا ایک زمانہ قائل رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شاد عظیم آبادی ۱۸۴۶ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے انہیں بڑی فیاضی سے علمی و ادبی ذوق اور موزونی طبع کی دولت سے نوازا تھا۔ عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم لائق اساتذہ سے حاصل کی۔ الفت حسین فریاد عظیم آبادی سے اپنی شاعری پر اصلاح لی اور میر انیس و مرزا دبیر کی صحبتوں سے فیض اٹھایا، مزید براں حالی اور سرسید سے ملاقات کا شرف بھی انہیں حاصل تھا، ان کی تعلیمی اور شعری اثر پذیری اور تبحر علمی سے متعلق حمید عظیم آبادی نے ''میخانۂ الہام'' میں لکھا ہے:

> ''شادؔ بیک واسطہ حضرت اشکی کے شاگرد اور خواجہ درد کے اسکول کے جید طالب العلم تھے۔ ان کے کلام میں بھی وہی اثر نظر آتا ہے جو درد کے مدرسے کے طلبہ کا طرۂ امتیاز تھا لیکن کہیں کہیں ان کا کلام اس لکھنوی مذاق سے بھی متاثر نظر آتا ہے جو اس وقت اودھ میں رائج تھا۔ جب میر انیس مغفور عظیم آباد آئے تو شاد پر ان کی شاعری اور خصوصاً اس فلسفہ کا اثر پڑا جو انیس کے بے مثل سلاموں میں پایا جاتا تھا۔ ان سے اثر پذیر ہو کر شادؔ نے ان چیزوں کو اپنے ہاں داخل کر کے اپنے فلسفۂ شاعری

شعبۂ اردو، فارسی، عربی، ایم ایس یونیورسٹی آف بڑودہ (گجرات)۔

www.shibliacademy.org

کی ایک ایسی مستحکم بنیاد رکھی جو اس وقت کی مبتذل شاعری کو روندنے والی تھی''۔(۱)

شادؔ کا شعری معیار بہت بلند ہے اور ان کا فلسفہ شاعری نہ صرف فارسی اور ہندی فلسفے کا نچوڑ ہے بلکہ انہوں نے فلسفۂ الٰہیات کے اکثر اہم مسائل پر جس فکر بلیغ سے روشنی ڈالی ہے وہ ان کی مذہبی رواداری اور قرآن واحادیث سے رغبت اور تعلق کا اہم ثبوت ہے۔ شادؔ نے شاعری میں ان موضوعات کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری کسی ایک صنف میں محدود نہیں تھی چنانچہ انہوں نے غزل کے علاوہ اردو اور تمام اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی لیکن غزل گوئی ان کی شاعری کا خصوصی میدان ہے جس کے وسیلے سے انہوں نے نہ صرف اپنے ذوقِ سلیم کو بروئے کار لاتے ہوئے مذاقِ زمانہ کی اصلاح کی ہے بلکہ اپنے ذوقِ لطیف کو ایک نئی سمت بھی دی ہے۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے لکھا ہے کہ:

> ''یوں تو ہر دور میں عظیم آباد کی مردم خیز خاک پاک سے کوئی نہ کوئی باکمال جلوہ گر ہو کر دنیائے شعر وادب کو اپنی ضوپاشی سے منور کرتا رہا لیکن جس دور سے جناب شاد کا تعلق ہے وہ زمانہ وہ تھا کہ داغ مرحوم کی زبان اور ان کی غزل سرائی کا بلبل ہزار داستاں چار دانگ عالم میں نغمہ سرا تھا۔ غزل گوئی کا رنگ کچھ اور تھا زمانہ کا مذاق بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا، یہاں تک کہ امیر مینائی کا سا محتاط شاعر بھی اس رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن جنابِ شاد کی دوررس نگاہیں غزل گوئی کے اصل مرکز پر پہنچ چکی تھیں اور زمانے کے مذاق سے متاثر ہونا تو درکنار انہوں نے زمانے کے مذاق کی اصلاح شروع کر دی''۔(۲)

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شادؔ اپنے زمانے کے نامور شعرا سے متاثر ہوئے بغیر اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے دور کے میلانِ شعری کی اصلاح کے لیے فکرمند تھے۔ یہی سبب ہے کہ شاد کی شاعری میں زندگی کی وہ صداقتیں بڑے پراثر انداز میں ملتی ہیں جن پر عمل پیرا ہوکر انسان اپنی زندگی سنوارنے کے ساتھ دوسروں کی رہبری اور رہ نمائی کا کارنامہ بھی انجام دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے غور کریں تو ان کے یہاں درس عمل ہے اور درس اخلاق بھی، درس عبرت ہے اور درس حیات بھی۔ شادؔ نے ان تمام مضامین کو اپنی شاعری میں ایسے خوش اسلوب پیرائے میں پیش کیا ہے جس کی مثال اردو شاعری میں کم ہی نظر آتی ہے اور یہی ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے اور

www.shibliacademy.org

انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز بھی کرتی ہے۔اس نوع کے چند اشعار یہ ہیں۔مثلاً جرأت رندانہ اور درس عمل سے متعلق شعر:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

درسِ حیات کا پہلو:

نکالیں بحرِ غم سے ڈوبتوں کو یہ کہاں ہمت خود اپنے ہاتھ سے اپنا ڈبونا ہم کو آتا ہے

درسِ اخلاق کے پہلو میں تغزل کی حسن کاری:

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

یہاں دل کا سوز و گداز بھی ہے اور خمریات کا جذب و کیف بھی اور رند کی مستانہ کیفیت کے ساتھ فلسفیانہ گہرائی بھی:

دے کے تہی سبو مجھے، صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا، اس سے کہیں سوا دیا

زبان و بیان کے ساتھ ساتھ خیالات میں لطافت اور پاکیزگی ہے اور صنعت تلمیح کے پیرائے میں بے صبری کا عمدہ نمونہ بھی:

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی! خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

اردو شاعری میں رندی و سرمستی کا ذکر عام اور پامال مضمون ہے، خصوصاً ریاض خیرآبادی اور غالبؔ کے یہاں اس قسم کے مضامین خوبصورت پیرائے میں باندھے گئے ہیں۔خمریاتی شاعری ریاض اور غالب کی طرح شاد کے یہاں بھی موجود ہے۔خمریات کے موضوع پر شادؔ نے اپنی شاعری میں جو رنگ پیدا کیا ہے وہ خالص ان کا اپنا رنگ ہے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہیں، لہٰذا ان کے یہاں خمریات کے نقوش نسبتاً گہرے ہو گئے ہیں۔

ان کی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت شوخی و ظرافت بھی ہے۔ان کے کلام میں جا بہ جا زندگی کے گوناگوں مسائل اس خوبصورتی سے ملتے ہیں کہ ان پر ایک مفکر اور فلسفی کا گمان ہوتا ہے۔ان کے یہاں کوئی مخصوص فلسفہ حیات نہیں ہے، تاہم انہوں نے غزل کو حقائق زندگی کے مختلف فلسفوں سے روشناس ضرور کیا اور اسے زندگی کا جامہ بھی عطا کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کا کلام غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور زندگی کو زندگی کی طرح جینے کا ہنر بھی۔شادؔ کی شاعری میں جہاں ایک طرف درد کا صوفیانہ عکس

www.shibliacademy.org

نظر آتا ہے وہیں دوسری جانب عالب کی شوخی اور تفکرانہ جذبات بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ غالب کا وہ مشہور شعر:

واعظ ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیابات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

غالب کے اس شعر میں شوخی بھی ہے اور ایک نازک خیال بھی۔ غالباً اسی موضوع کو سامنے رکھ کر شادؔ نے اپنے کلام میں جدت پیدا کرنے کی سعی کی ہے، مثلاً:

جو مے کدے میں گئے ہم تو با وضو ہوکر لیا جو ہاتھ میں ساغر تو قبلہ رو ہوکر

شرابِ شوق نہ افراط سے پلا ساقی ٹپک پڑے گی مرے لب سے گفتگو ہوکر

شاد کے کلام میں فارسی شعرا کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں اس لیے کہا گیا کہ ''ان کی غزل سرائی میں میر کا سوز و گداز، رباعیوں میں عمر خیام کی سرمستیاں، مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر سلاست و بلاغت، قطعات میں ابن یمین و سعدی کی سحر نگاری اور مثنوی میں میر حسن کے قلم کی جادو بیانی جلوہ گر ہے''۔(۳) شاد فارسی شاعری کی روایتوں سے بخوبی واقف تھے یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں فارسی کے مشہور غزل گو شاعر حافظ شیرازی کا تتبع ملتا ہے۔ ان کے کلام میں فارسی کے اثرات اسی اتباع کی دین ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

شعروں میں اے شادؔ یہ باطنیت تم حافظِ وقت ہو ثم باللہ

شاد کو اپنی عظمت کا احساس تھا، لہٰذا انہوں نے خود کو حافظِ وقت کہا ہے۔ باوجود یکہ ان کے کلام میں فارسی کے دیگر شعرا کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ امیر خسرو کے کلام کی جھلک اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امیر خسرو کا یہ شعر:

ازسرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب دردمند عشق را دار و بجز دیدار نیست

اے نادان طبیب، میرے سرہانے سے اٹھ جا کیونکہ عشق کے بیمار کے لیے محبوب کے دیدار کے علاوہ اور کوئی علاج نہیں ہے۔

اس کی پیروی میں شاد کا یہ شعر:

مبارک ہو کہ وقتِ نزع وہ بالیں پہ آئے گا دکھائے گی تماشا ہم کو چشمِ نیم باز اس کا

شاد کی شاعری کا خاص جوہر ان کا زورِ کلام ہے۔ شاعری میں الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی، تخیل کی بلند پروازی اور مضامین کا زور کچھ اور ہی رنگ دکھاتے ہیں۔ یہ تمام اصناف شعری

www.shibliacademy.org

شاد کے کلام میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ان خصوصیات کے حامل چند اشعار یہ ہیں:

جہنم کی دہکتی آگ کو دم میں بجھا دوں گا سمندر باندھ کر لایا ہوں اپنے دیدۂ تر میں

ساقیا جام میں یوں ڈھال، کہ چھینٹیں نہ اڑیں جتنے بیٹھے ہیں یہاں، صاحبِ تقویٰ سب ہیں

غزلوں اور دیگر شعری اصناف کے علاوہ شاد کی مثنویاں بھی خاص اہمیت اور جاذبیت رکھتی ہیں، جس میں انہں نے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔غزلوں کے بعد شاد کے یہاں جو صنف زیادہ وقیع و پرکشش ہے وہ ان کی مثنویات ہیں، جو ان کے مزاج اور فطانت کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ان میں ''نالۂ شاد'' ایک مختصر عشقیہ مثنوی ہے، جس میں ان کے جمالیاتی احساس اور قدرتِ کلام کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔''مثنوی ثمرۂ زندگی'' جسے شاد نے اپنے فرزند سید حسین کی بسم اللہ کے موقع پر تصنیف کی تھی۔''مثنوی فغان دلکش'' فارسی میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔ایک مثنوی ''چشمہ کوثر'' بھی ہے جو پند و نصائح پر مشتمل ہے لیکن ان کی سب سے اہم مثنوی ''مادرِ ہند'' ہے۔یہ ایک سیاسی مثنوی ہے جسے ملکی ضرورتوں اور زمانے کی روش کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا تھا۔ملک ہند کی تعریف میں اس مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

عظمت میں کنشت سے فزوں تر خوبی میں بہشت سے فزوں تر

ہر گوشہ زمیں کا رشکِ گلشن جس نخل کو دیکھیے وہ چندن

کہتا تھا یہ دیکھ کر زمانہ دونوں سے ہے گھر نگار خانہ

ازبسکہ دلوں میں تھی صفائی دستار بدل تھے دونوں بھائی

اس مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد نہ صرف سرزمین ہند اور برادرانِ وطن سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے بلکہ یہاں کی مٹی، پیڑ پودے، حتیٰ کہ چرند و پرند سے بھی خاص تعلق تھا۔اس مثنوی کا وہ حصہ جہاں انہوں نے ملک کے دو بھائیوں رام اور رحیم کا ذکر کیا ہے، اخوت و ملنساری کا نقطۂ عروج ہے۔گو کہ شاد کی مثنویاں ان کی غزلوں کی طرح بہت معیاری نہیں تاہم ان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں۔ان کی مثنوی ''مادر ہند'' کے ضمن میں رشید احمد صدیقی کا یہ خیال بے حد اہم ہے:

''شاعر نے کمالِ فن کے اعتبار سے کوتاہی نہیں کی ہے، ایسے شخص سے ممکن ہے لغزش ہوئی ہو لیکن جس چیز نے شخص اور شاعر کو بڑی حد تک متوازی کر دیا ہے وہ جذبۂ وطن دوستی ہے۔شاد

www.shibliacademy.org

نے ہندو مسلمانوں کو اچھے رنگ میں پیش کیا ہے۔ان سے متعلق مادر ہند کی زبان سے جو کلمے ادا کرائے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ پر قطعاً موزوں اور فطری ہیں جن سے شاد کی بلند نظیری، سیر چشمی اور اخوت کا پتہ چلتا ہے.....لیکن یہاں بھی شاعر کی سیرت کا ایک دلکش نقش نمایاں ہے، یعنی شاد ابنائے وطن کی شکایت میں شعر و شاعری کی خدمت اور منزلت کو نظر انداز نہیں کرتے"۔(۴)

شاد کا ایک اور کمال مرثیہ نگاری کا بھی ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اردو مرثیہ نگاری میں میر انیس اور مرزا دبیر کا مقام سب سے بلند ہے انہوں نے صنف مرثیہ کو نہ صرف ثروت مندی بخشی ہے بلکہ بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔دبستان عظیم آباد میں بھی چند فنکار ہیں، جنھوں نے اس میدان میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ان میں ایک نام شاہ محمد ہاشم حسین آبادی کا ہے اور دوسرا شاد عظیم آبادی کا۔دونوں نے صنف مرثیہ میں تجربے کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔شاد نے مجالس کے سلسلے میں عظیم آباد کے علاوہ دور دراز کے علاقوں مثلاً لکھنؤ، کلکتہ، بنارس، کانپور اور مظفر پور وغیرہ کا سفر کیا اور مرثیے بھی پڑھے۔ان کا ایک مرثیہ "احوالِ شہادتِ حسین" ہے، جس کا ایک بند یہ ہے:

اے سرمۂ تحقیق ان آنکھوں کو ضیا دے اے تکملۂ نفس، بصیرت کو بڑھا دے
اے ذوقِ معانی مری باتوں میں مزا دے ہلکا سا جو ہے بیچ میں پردہ وہ اٹھا دے
وہ شے مجھے درکار ہے جس شے کی کمی ہے دھل جائے اس آئینے پہ جو گرد جمی ہے

رباعی میں بھی شاد نے کامیاب تجربے کیے ہیں۔رباعی گو شعراء میں میر، سودا، درد، میر انیس، غالب، ذوق، مومن اور حالی وغیرہ شامل ہیں۔شاد نے بھی اس صنف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی رباعیاں عموماً صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ان کی غزلوں میں تصوف کے مضامین ملتے ہیں لیکن رباعیوں میں یہ اثرات نسبتاً زیادہ گہرے اور نمایاں ہیں۔ان کی رباعیات سادگی اور جوش سے پُر ہیں اور مفہوم و مطالب کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ بھی ہیں۔ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مضامین وسیع ہیں لیکن ان کی ادائیگی کا انداز جداگانہ ہے۔ساقی کا کرم، پیر خرابات کی غم خواری، دل میں ہر وقت خدا کی موجودگی، ہر قصد میں ذاتِ خدا کی طلب، یہ سب ایسے مضامین ہیں جن کو بار بار برتا گیا ہے۔ایک ہی مضمون میں متنوع اسالیب ان کے یہاں جلوہ گر ہوئے ہیں۔مثلاً:

ہر دم مرے دل میں تو ہی موجود رہے ہر قصد میں یارا تو ہی مقصود رہے

www.shibliacademy.org

جب آنکھ اٹھاؤں تیرا جلوہ دیکھوں جب سر کو جھکاؤں تو ہی مسجود رہے

ساقی کے کرم سے فیض یہ جاری ہے یا پیرِ خرابات کی غم خواری ہے
صف توڑ کے بٹ رہی ہے رندوں کو شراب معلوم نہیں کہ میری کب باری ہے

شاد عظیم آبادی کی شاعری کا جوہر گرچہ غزل میں کھلتا ہے لیکن رباعی میں انہوں نے جس فنکارانہ طریقے سے مسائل تصوف کو جن جن تعبیروں میں پیش کیا ہے اردو شاعری میں ایسی نظیریں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ جس طرح غزل کو انہوں نے اپنے فنی و فکری اظہار کا وسیلہ بنایا اور اسے ایک معیار عطا کیا ہے، اسی طرح رباعیوں کو بھی اپنے فکر و احساس کا ذریعہ بنایا اور اس میں اپنے خیال اور تجربہ کو مربوط طریقہ سے واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی رباعیاں فنی معیار پر پورا اترنے کے ساتھ رباعی نگاری کے لوازمات سے بھی آراستہ ہیں۔ جیسا کہ حمید عظیم آبادی رقم طراز ہیں:

> ''استاد مرحوم کی رباعیاں ان کی پوری پوری ترجمانی کر رہی ہیں۔ رباعیوں کی جو شان ہونی چاہیے، وہ ہر رباعی سے ظاہر ہے۔ اردو کا جہاں تک تعلق ہے حضرت شاد نے رباعیوں میں بھی اپنی شمشیر طبع کا جوہر دکھانے میں کوتاہ دستی سے کام نہیں لیا ہے۔ کمال مشق کا ہر مصرع آئینہ دار ہے اور ہر رباعی سے ذی کمالی ہویدا''۔(۵)

شاد کی زندگی اور ان کی شاعری تصوف، فلسفہ اور تغزل سے معمور تھی، لہٰذا ان کے یہاں ان امور کی شمولیت ایک مخصوص لَے کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ عناصر ان کے شعری وقار میں اضافے کا سبب بنتے ہیں اور ان کے کلام میں سوز و گداز اور شعریت بھی پیدا کرتے ہیں۔ شاد نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف دبستانِ عظیم آباد کا نام روشن کیا ہے بلکہ اردو شاعری کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ بھی کیا ہے، اردو دنیا شاد کا نام کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حوالہ جات

(۱) میخانۂ الہام: مرتبہ حمید عظیم آبادی، ص: ر، مطبوعہ برقی مشین پریس۔ بانکی پور مراد آباد، پٹنہ، سن ندارد۔ (۲) رباعیات شاد: صغریٰ ہمایوں مرزا، ص ۲۲، کرشنا پریس، پٹنہ سٹی، سن ندارد۔ (۳) پیش لفظ بادۂ عرفاں: سید محمود علی صبا، ص ۸، شاد بک ڈپو، پٹنہ۔ ۱۹۶۱ء۔ (۴) تقریب مثنوی مادر ہند: رشید احمد صدیقی، ص ۲۴، ۲۵۔ شاد بک ڈپو، پٹنہ سٹی۔ ۱۹۳۱ء۔
(۵) رباعیاتِ شاد: حمید عظیم آبادی، ص ۲۸، کرشنا پریس، پٹنہ سٹی، سن ندارد

www.shibliacademy.org

اخبار علمیہ

''اغلاط سے پُر قرآن مجید کی طباعت واشاعت پر پابندی''

قرآن مجید کی حفاظت وصیانت رب کائنات نے اپنے ذمہ لی ہے۔اس میں کسی بھی قسم کی غلطی کا صدور ووجود ممکن نہیں ہے۔لیکن شیاطین من الانس کی جانب سے اس کی اس نمایاں ترین خوبی وصفت کو بدنما بنانے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے۔ایک خبر کے مطابق حال میں الجیریا کی وزارت الشؤن الدینیہ نے حفاظ وائمہ کرام کی قرآن مجید کے ایک مطبوعہ نسخہ میں متعدد غلطیوں کی نشاندہی کے بعد مساجد، مدارس اور کتب خانوں سے اس کی تمام کاپیوں کو ہٹانے اور مسترد کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔وزارت نے اس نسخہ کی طباعت واشاعت کے ذمہ داروں سے مواخذہ اور ثبوت فراہم ہونے پر ان کے خلاف عدالتی کارروائی کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔ تاہم رپورٹ میں غلطیوں کی نوعیت کے متعلق کوئی وضاحت درج نہیں ہے۔قرآن مجید کی حقانیت وصداقت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ عمداً یا سہواً اس میں کی جانے والی غلطیوں کے انکشاف کے بعد فوراً ہی اس کا ازالہ ہوجاتا ہے اور اس قسم کے نسخوں کا متداول رہنا ناممکن ہوجاتا ہے۔مختلف ذرائع ابلاغ بالخصوص سوشل میڈیا میں قادیانیوں کے انگریزی ترجمہ قرآن مجید کے متعلق یہ خبر بھی گردش کررہی ہے کہ اس میں عمداً ختم نبوت کے حوالہ سے بہت کچھ تحریف کی گئی ہے۔(بحوالہ صراط مستقیم، برمنگھم، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۳۱)

''کتوں میں انسانی نفسیات سمجھنے کی لیاقت پر تحقیق''

لندن کی ایک یونیورسٹی کے محققین نفسیات نے انکشاف کیا ہے کہ کتّے انسان کے موڈ، خوف، خوشی اور بعض دیگر احساسات کو اس کے چہرے سے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کے اندر حرکت قلب اور تناؤ کو محسوس کرنے کی لیاقت ہوتی ہے اور انسان کے چہرے پر رونما ہونے والے اثرات کو دیکھتے ہوئے اس کی باطنی کیفیت، موڈ اور مزاج کا اندازہ کرلیتے ہیں۔خوشی، غم، افسردگی، خوف اور غصہ کو سمجھنے کی صلاحیت ہی کے ذریعہ وہ اپنے مالک اور دیگر افراد کے ساتھ رویہ اختیار کرتے ہیں۔اکثر کتّے آواز سے انسانی موڈ کو سمجھ جاتے ہیں۔رپورٹ کے مطابق اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کتّے عام طور پر سب پر نہیں بھونکتے۔کسی غیر معمولی حرکت یا خوف کے عالم میں نظر آنے والوں پر وہ زیادہ بھونکتے ہیں۔اس تحقیق میں کتّے کی سونگھنے کی صلاحیت کے متعلق یہ بات درج ہے کہ انسان کے احساس اور اس کی شخصیت کو بھانپنے کے لیے کتّے اپنی قوت شامہ کا استعمال کرتے ہیں اور مکمل واقفیت حاصل کرتے ہوئے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(جرنل ''لرننگ اینڈ بی ہیویئر'' بحوالہ احمد ٹائمز، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۲۸)

www.shibliacademy.org

''ڈیزل کے فضلہ سے روشنائی''

بنگلور میں ایک نمائش کے دوران طاہرہ پیراہ نے دست کاری کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جسے ڈیزل کے فضلے سے تیار کی گئی روشنائی سے رنگا گیا تھا۔ اس فضلے کے مضر اجزا (Particulate Matter) جیسے ہی فضا میں خارج ہوتے ہیں انہیں دہلی کے ایک تحقیقی ادارے کی ایجاد کردہ مشین جسے ''چکر شیلڈ'' نام دیا گیا ہے کے ذریعہ فوراً روشنائی میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ Dell کمپنی اب تک ایک لاکھ پچاس ہزار ڈبوں کے لیبل اس سے حاصل شدہ روشنائی سے طبع کرچکی ہے۔ اس مشین کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ڈیزل انجن سے جوڑا جاسکتا ہے اور یہ تقریباً ۹۰٪ پارٹی کولیٹ میٹر کو فضا میں خارج ہوتے ہی مقید کرکے روشنائی میں تبدیل کرسکتی ہے۔ (اردو سائنس ماہنامہ، دہلی اگست ۲۰۱۸ء، ص ۵۵)

''پانی میں آلودگی کا پتہ لگانے والی ٹکنالوجی''

نیشنل سینٹر فار کمپوزیشنل کریکٹرائزیشن آف مٹیریلز (این سی سی ایم) نے پانی میں فلورائیڈ، کرومیم (VI) اور لوہے کا پتہ لگانے کے لیے ایک ویژویل (مرئی) کٹ تیار کی ہے۔ اس کے ذریعہ پانچ منٹ کے اندر اندر پانی میں ان اشیا کی موجودگی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان ویژویل کٹس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی لے جایا جاسکتا ہے۔ یہ کٹس نجی صنعت کاروں کو منتقل کردی گئی ہیں اور اب بازار میں دستیاب بھی ہیں۔ پانی میں آلودگی کا پتہ لگانے والی ان کٹوں کے اندر مختلف بوتلوں میں ریجینٹس رکھے جاتے ہیں جنہیں پانی کے نمونوں میں ملا کر دو منٹ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر اوپری سطح پر رنگ ظاہر ہوجاتا ہے جس کا موازنہ رنگوں کے چارٹ سے کیا جاتا ہے۔ رنگوں کی شدت سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ آلودہ پانی میں کتنی ملاوٹ ہے۔ لوہے کی مقدار کا پتہ لگانے والی کٹ تیاری کے آخری مرحلہ میں ہے اور بہت جلد یہ صنعت کاروں کو فراہم کردی جائے گی۔ (تفصیل اخبار مشرق، نئی دہلی، ۶/اگست ۲۰۱۸ء، ص ۶ پر ملاحظہ کریں)

''بلجیم کے ۸ سالہ بچے کا یونیورسٹی میں داخلہ''

اس بچہ کا نام ''لورین سمنس'' ہے۔ اس نے محض دو سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اس نے تین برس کی عمر میں کردیا تھا۔ چار برس کی عمر میں پرائمری تعلیم مکمل کرکے اسکول چلا گیا۔ چھ سال کی عمر میں ایجوکیشن کی تکمیل کے بعد ہائی اسکول ڈپلومہ کے لیے داخلہ لیا اور ڈیڑھ سال میں اس کی تکمیل کرلی، ہائی اسکول میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے اس ننھے بچے کو ریسرچ میتھ میں گریجویشن کے بعد بلجیم کی ایک معروف یونیورسٹی نے ماسٹر کے لیے داخلہ دے دیا ہے۔ ہائی اسکول میں ایک درجن سے زیادہ

www.shibliacademy.org

مضامین بالخصوص ریاضی میں امتیازی نمبروں سے اس کمسن نے پوزیشن حاصل کی تھی۔ کم سونے، کم کھانے اور کم بولنے کے سبب اس کو لہو ولعب سے پرہیز ہے۔ مطالعہ وتحقیق اور سائنسی مسائل وموضوعات کی افہام وتفہیم سے اس کو زیادہ دلچسپی ہے اور اپنا دماغ زیادہ تر انہیں مسائل میں لگاتا ہے۔ پہلے خلائی تحقیق اور خلابازی کے میدان میں ہاتھ مارنے کا عزم تھا لیکن یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد کمپیوٹر گیم ٹکنالوجی میں اس کا ذوق وشوق اور رجحان بڑھ گیا ہے حالانکہ اس کے بیان کے مطابق ریاضی میں الجبرا اور شماریات سمیت جیومیٹری اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ (مفصل رپورٹ منصف حیدرآباد، ۳/جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

''گھوڑے کی حنوط شدہ لاش کی دریافت''

سائبیریا میں ایک تحقیقی منصوبہ کے لیے جاری کھدائی کے دوران گھوڑے کے بچے کی حنوط شدہ لاش برآمد ہوئی ہے جو پہلی نظر میں سویا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو پہلے جاپان لایا گیا جہاں ماہرین نے اس کی عمر ۳۰ سے ۴۰ ہزار سال قبل متعین کی ہے۔ اس کے بعد روس لاکر شمال مغربی وفاقی یونیورسٹی کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ تاریخی دریافت قدیم ترین ہونے کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ اس کا قد تین فٹ کے قریب ہے۔ منفرد طریقے سے حنوط کیے جانے کے سبب نہ صرف اس کے بیرونی اندرونی اعضا بھی بالکل درست حالت میں ہیں۔ سائنس دانوں نے اس دریافت کو بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے زمانہ قدیم کے مطالعہ اور انسانی تہذیب وتمدن اور جانوروں کے نمو سے متعلق ارتقائی عمل کو سمجھنے کا موقع میسر آئے گا۔ (دیکھیے انقلاب، وارانسی، ۲۸/اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۱)

''پانچ سالہ بچی ایستھر لی کی ذہانت''

اس ننھی بچی کا تعلق آسٹریلیا کی راجدھانی سڈنی سے ہے۔ اس نے دو سال کی عمر میں ہی ۱۹۵ ممالک کی راجدھانیوں کے نام یاد کر لیے تھے اور اسی عمر میں تین زبانوں میں گفتگو بھی کر سکتی تھی۔ راجدھانیوں کے نام وہ کسی بھی ترتیب میں بتا سکتی تھی۔ خبر کے مطابق حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ شیکسپیئر کے لمبے لمبے ڈراموں کے ایک ایک سین بھی اس نے یاد کر لیے ہیں۔ جیسے ہی رومیو جولیٹ کے ایکٹ ٹو کے بارے میں اس سے پوچھا گیا تو اس نے ایک سانس میں بغیر رکے پورا منظر سامنے رکھ دیا۔ وہ اٹھارہ مہینے کی تھی تبھی اس کے والدین کو اس کی اس استعجاب انگیز صلاحیت کا اچانک پتہ چلا۔ (تفصیل روزنامہ ''ہندوستان'' ہندی وارانسی ایڈیشن، ۱۴/اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۴ پر ملاحظہ ہو)

ک، ص اصلاحی

www.shibliacademy.org

آثار علمیہ وتاریخیہ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک عربی مکتوب

مولوی طلحہ نعمت ندوی

علامہ ابوالولید ازرقی کی مشہور کتاب اخبار مکۃ وما جاء فیھا من الآثار کے موجودہ محقق ایڈیشن مطبوعہ مکتبۃ الثقافۃ مکہ مکرمہ کے آغاز میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک مکتوب شامل ہے جو شاید اس کے محقق جناب رشیدی الصالح ملتمس صاحب کے استفسار کے جواب میں لکھا گیا ہے یا انہوں نے اپنی تحقیق پیش کر کے سید صاحب سے رائے لی ہو، یہ مکتوب اہم علمی وتحقیقی بحث پر مشتمل ہے، اس لیے قارئین کی خدمت میں ایک اہم علمی یادگار سمجھ کر پیش کیا جارہا ہے، مکتوب کا بقیہ حصہ حذف کر کے محقق نے صرف متعلقہ حصہ ہی تعلیقات مولانا سلیمان الندوی کے زیر عنوان شامل کتاب کیا ہے اور پھر قال الاستاذ کے بعد مکتوب کا متعلقہ حصہ درج کیا ہے۔

سید صاحب لکھتے ہیں:

اما الورقتن من كتاب الازرقي فقراتهما وقرأت ما علقتم عليهما من الحواشي المفيدة و جميعها صحيح غير كلمتين ص ۲۲۷ رقم ٦ "اصبهيذ" فإنه ليست معربة من التاتارية ولا هي مذكورة في شفاء الغليل نعم ذكر في شفاء الغليل "اسبذ" (ص ۱۴ طبع مصر) وقال فيه "اسم قائد قواد كسرى" اهـ. والأصل أن الكلمة مركبة من كلمتين فارسيتين اولا هما "سباه" وآخرتها "بذ" ومعنى الأولى "العسكر" ومعنى الاخرى "بذ" رئيس أو الأمير كما نرى في الكلمات الفارسية المعربة مثل جهبذ وموبذ وغيرهما فمعنى اصبهيذ أمير العسكر۔

وفي ص ۲۳۰ رقم ۸ وضعتم في أصل المتن "الخولخي" والصحيح

استھانواں، بہار شریف۔

www.shibliacademy.org

"الخولجي" ومخففة "خلجي" قوم من الترک وقد حکمت عائلة منهم علی الهند ویعرفون بالخلجیة. اهـ

ازرقی کی کتاب کے دونوں صفحات اور آپ نے اس پر جو مفید حاشیہ تحریر فرمایا ہے میری نظر سے گزرے، ساری باتیں درست ہیں، البتہ دو جگہ قابل تصحیح ہے، ایک صفحہ ۲۲۷ پر نمبر ۶ کے تحت "اصبہیذ" کا لفظ آیا ہے، یہ تاتاری زبان کا لفظ نہیں ہے، نہ شفاء الغلیل میں مذکور ہے، ہاں شفاء الغلیل میں "اسبذ" کا لفظ آیا ہے اور اس کی تشریح میں "کسری کے سپہ سالار کا نام" لکھا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ دو فارسی الفاظ سے مرکب ہے، جن میں ایک لفظ "سپاہ" اور دوسرا "بذ" ہے، پہلے لفظ کے معنی لشکر اور دوسرے کے معنی امیر اور قائد کے ہیں جیسا کہ ہمیں بہت سے فارسی الفاظ میں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں، مثلاً جہبذ اور موبذ اور اس طرح کے دوسرے الفاظ ہیں، لہٰذا اصبہیذ کے معنی میر لشکر کے ہوئے۔

اور صفحہ ۲۳۰ کے نمبر ۸ پر آپ نے متن میں "الخولخی" لکھا ہے، اس کو خولجی ہونا چاہیے جس کا مخف خلجی ہے، یہ ایک ترکی نسل ہے، اس نسل کے ایک خاندان نے ہندوستان میں بھی حکومت کی ہے جنہیں خلجی خاندان کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک اہم اعلان

مطبوعات دارالمصنّفین "ای بک فارمیٹ" میں دستیاب

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ الحمدللہ اپنے محدود وسائل کے باوجود مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی قدیم وجدید مطبوعات کے پُرکشش اور دیدہ زیب ایڈیشن تیار کرکے اہل علم وتحقیق اور قدردانوں کی خدمت میں پہنچانے کی کوششیں تیز تر کردی ہیں۔ چند مہینوں قبل شائقین کتب بالخصوص انٹرنیٹ پر مطالعہ وکتب بینی کی عادی نسل نو کی سہولت کے پیش نظر اپنی اہم مطبوعات کی پی ڈی ایف "eBook-PDF" میں مناسب قیمت پر درج ذیل ویب سائٹ پر فراہم کردی ہے۔

کتابیں آن لائن خریدی اور پرنٹ بھی کی جاسکتی ہیں۔ www.shibliebooks.com

جوائنٹ سکریٹری

(ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی)

www.shibliacademy.org

معارف کی ڈاک

غیر مسلم مصنّفین اور سیرت نبویؐ

۲۲/اگست ۲۰۱۸ء
ایف ۔ ۲۳۷، لوئر ہری سنگھ نگر،
اہاڑی کالونی، جموں، ۱۸۰۰۰۵

مکرمی مدیر اعلیٰ! آداب

معارف اگست ۲۰۱۸ء کا شمارہ ملا۔ فہرست مضامین کو دیکھتے ہوئے نظر ڈاکٹر شمس بدایونی کے مضمون ''غیر مسلم مصنّفین اور سیرت نبویؐ'' پر رکی۔ سب سے پہلے اسی مضمون کو پڑھ ڈالا۔

شمس صاحب نے یورپین مصنّفین کے ساتھ ساتھ ان ہندو مصنّفین کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی حیات، ان کے ذریعے اس وقت کے معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعتوں کو مٹانے اور ایک ایشور کو ماننے کی تلقین پر زور دینے کی حمایت کی ہے۔

اردو زبان کی یہ خوبی رہی ہے کہ ملکی تقسیم سے قبل ہر مذہب کی مقدس کتب کے ترجمے اس زبان میں ملتے تھے۔ عوام ایک دوسرے کے مذہب سے متعلق جانتے تھے۔ تقسیم کے بعد آبادی کا ایک بڑا طبقہ اس زبان سے دور ہوتا چلا گیا اور اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ ملک میں مذہبی انتشار اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس کے انجام سے ڈر لگتا ہے۔

ایسے وقت میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا یہ مضمون اندھیرے میں روشنی کی کرن کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اسے ہم قومی یکجہتی کی ایک عمدہ مثال بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شمس بدایونی کے ساتھ مدیر معارف بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری درخواست ہے کہ مدیر اعلیٰ اس سلسلے کو آیندہ بھی جاری رکھیں گے۔ آج عید ہے اس کی مبارک باد بھی قبول کیجیے۔

مخلص

ڈاکٹر ٹی ۔ آر ۔ رینا

www.shibliacademy.org

وفیات

پروفیسر فواد سزکین

اشتیاق احمد ظلی

عالم اسلام کے سب سے بڑے محقق، مصنف اور اسلامی علوم اور سائنس کے عظیم مورخ پروفیسر فواد سزکین ۳۰؍جون ۲۰۱۸ء کو استانبول میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔ ان کی تدفین سلطان احمد اسکوائر کے گل خانہ پارک میں اس معہد کے قریب ہوئی جس کو انہوں نے قائم کیا تھا۔ صدر طیب اردوغان کی قیادت میں ترکی نے جس عقیدت واحترام سے انہیں رخصت کیا جدید ترکی کی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ صدر نے متعدد وزراء کے ساتھ نہ صرف نماز جنازہ میں شرکت کی بلکہ جنازہ کی مشایعت بھی کی (۱)۔ اس سے جہاں ان کے غیر معمولی مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ترکی کے بدلتے ہوئے منظر نامہ کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کچھ دنوں پہلے اسلامی علوم کے کسی فاضل کے لیے سرکاری سطح پر اس احترام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پروفیسر سزکین ایک قاموسی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے جو علمی اور تحقیقی ورثہ چھوڑا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ انہوں نے تنہا جو کام انجام دیا بڑی بڑی اکیڈمیاں بھی وہ کام انجام نہ دے پائیں۔ ان کا علمی کام کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ایسا عظیم الشان ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اتنا بڑا کارنامہ ایک اکیلے شخص نے کیسے انجام دیا (۲)۔ انہوں نے اوائل عمر میں اپنے لیے جس مشن کا انتخاب کیا تھا اس کی تکمیل میں اپنی پوری عمر صرف کردی۔ انہیں ہم اپنی تاریخ کے اعاظم رجال میں شمار کریں تو بے جا نہ ہو۔ ان کے سوانح نگار نے بجا طور پر ان کو مکتشف الکنز لمفقود کا لقب دیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے علم وسائنس کا ایک بے بہا خزانہ چھوڑا لیکن ہم اس سے ناواقف تھے۔ اہل مغرب جو اس سے واقف تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اور اس سے واقف ہو۔ چنانچہ وہ وقت کی گرد کی دبیز تہوں کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ جب پروفیسر سزکین کی عمر بھر کی شبانہ روز کی

www.shibliacademy.org

کوششوں کی وجہ سے اس کا روشن چہرہ سامنے آیا تو دنیا ششدر رہ گئی۔ مغربی دانش وری یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ علم و سائنس کے میدان میں مسلمان علماء اور محققین کے اکتسابات اتنی غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہیں لیکن آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کے مصداق یہ معاملہ اتنا واضح اور فیصلہ کن نوعیت کا حامل تھا کہ اس سے انکار ممکن نہیں رہا۔

علم و دانش کی دنیا میں گذشتہ کئی صدیوں سے مغرب کے ہمہ گیر علمی اور فکری تسلط کے زیر اثر جو بیانیہ رائج رہا ہے اس کا ارتکاز مکمل طور پر مغرب پر (Eurocentric) رہا ہے۔ اس بیانیہ کے مطابق علم و دانش کی ابتدا یوروپ کے ایک خطہ یونان میں ہوئی۔ بعد میں چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدی میں یوروپ میں اس کا احیاء ہوا۔ اس کے لیے Renaissance یعنی نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کا مطلب ہی احیاء یا تجدید ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یوروپ کی علمی ترقی کسی طرح کے بیرونی اثرات کی منت کش نہیں ہے بلکہ وہ ان نظریات و افکار کے تحت رونما ہوئی ہے جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ یہ دراصل بہت سوچی سمجھی اور منصوبہ بند کوشش تھی اور اس کا مقصد یوروپ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں مسلمان علماء اور محققین کے اساسی کردار کا انکار تھا۔ اس کے لیے طرح طرح کے طریقے اختیار کیے گئے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یوروپ کی سائنسی اور علمی پیش رفت براہ راست مسلمانوں کی علمی اور فکری کاوشوں سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ یہ کسی پرانے علم کے احیاء کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ علوم جو یونان اور بازنطینی مآخذ سے یوروپ تک پہنچے ان کے اندر اتنے ترقی یافتہ علوم کی اساس بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ پہلے یہ بات کسی نہ کسی درجہ میں معلوم تھی اور بعض مغربی مصنّفین نے کسی نہ کسی انداز میں اس کا اعتراف اور اقرار بھی کیا ہے لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کو جس مرحلہ تک پہنچا دیا تھا اس کے بعد اگلا مرحلہ آسان بھی تھا اور فطری بھی۔ یہ علوم یوروپ میں پہلے صقلیہ کے ذریعہ اور بعد میں اندلس کے ذریعہ پہنچے۔ اس کے بعد یوروپ نے پورے جوش و خروش سے انہیں آگے بڑھایا اور مسلمان صدیوں کے لیے اس طرح سو گئے کہ انہیں اپنے اسلاف کے ان لازوال کارناموں کی خبر بھی نہیں رہی۔ دنیا کو یہ باور کرا دیا گیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو بھی ترقی ہوئی ہے وہ پوری طرح یورپ کی رہینِ منت ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمان مفکرین اور سائنس دانوں کا جو

www.shibliacademy.org

اساسی کردار رہا ہے اس کا یا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا اور اگر بدرجہ مجبوری کہیں اس کا ذکر کرنا ہی پڑ جاتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ حاشیہ میں جگہ ملتی ہے۔(۳)

تاریخ کے اس سب سے بڑے جھوٹ، فریب اور چوری کا پردہ چاک کرنے کا کریڈٹ پروفیسر فواد سزکین کو جاتا ہے۔ اپنی گراں مایہ تحقیقات سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیاد دراصل مسلمانوں ہی نے رکھی اور اس کی اساس انہی کی تحقیقات، افکار، نظریات اور اختراعات پر قائم ہے۔ اس فریب کا پردہ انہوں نے اس طرح چاک کر دیا کہ اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ کام انہوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے کسی خاص شعبہ میں نہیں کیا بلکہ ان علوم کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے علمی ورثہ کو اس وضاحت اور صراحت سے پیش کر دیا کہ کسی انصاف پسند شخص کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسکالرس کی ایک ٹیم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہوتا تو بھی یہ غیر معمولی واقعہ ہوتا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی توفیق ایک تنہا آدمی کو ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اس پس منظر میں یہ بات باعث حیرت وافسوس ہے کہ اردو دنیا پروفیسر سزکین کے کارناموں سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ جو لوگ کسی حد تک واقف بھی ہیں ان میں سے بھی اکثر کے سامنے پوری صورت حال نہیں ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کی مناسبت سے ان کے کارہائے نمایاں کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے۔ البتہ ان کے کام کا کینوس اتنا بڑا ہے اور وہ اتنا کثیر الجہات ہے کہ اس کے مختصر ذکر کے لیے بھی کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

پروفیسر فواد سزگین کا نام ترکی میں Fuat Sezgin لکھا جاتا ہے۔ ان کا پورا نام محمد فواد سزگین تھا۔ ''مجاز القرآن'' کے سرورق پر ان کا یہی نام لکھا ہوا ہے۔ البتہ بعد میں ان کا نام صرف فواد سزگین لکھا جاتا رہا ہے اور دنیا عام طور پر ان کو اسی نام سے جانتی ہے۔ فواد سزگین ۲۴/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مشرقی ترکی میں بٹلیس (Bitles) میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے (۴)۔ ان کے والد محمد سزگین کا تعلق محکمہ قضا سے تھا۔ بعد میں انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا (۵)۔ ابتدائی تعلیم ارضروم اور دوغوبایزید میں حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے استانبول کا رخ کیا۔ ان کا ارادہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا لیکن قضا وقدر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ استانبول میں انہیں مشہور جرمن مستشرق

www.shibliacademy.org

ہلمٹ رٹر (۱۸۹۲۔۱۹۷۱ء) (Helmutt Ritter) کا لکچر سننے کا موقع ملا۔ اس اتفاقی واقعہ نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ ہلمٹ رٹر ایک جرمن مستشرق تھے۔ انہوں نے کارل بروکلمان (۱۸۶۸۔۱۹۵۶ء)، تھیوڈور نولدیکہ (۱۸۳۶۔۱۹۳۰ء) اور کارل ہنرخ بیکر (۱۸۷۶۔ ۱۹۳۳ء) جیسے اساطین استشراق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ استانبول یونیورسٹی کے معہد الدراسات الشرقیہ کے ڈائرکٹر تھے۔ طویل عرصہ تک ترکی میں مقیم رہے۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ عربی، فارسی ادبیات، ترکی شاعری اور تصوف جیسے موضوعات میں ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ان موضوعات پر تحقیقات کا وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ مخطوطات سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور استانبول کی لائبریریوں میں محفوظ متعدد مخطوطات کا انہوں نے تعارف کرایا تھا۔ جو کتابیں ان کی توجہ اور دلچسپی سے شائع ہوئیں ان میں ابن الندیم، سنائی، عطّار اور رومی کی تخلیقات کے علاوہ ابوالحسن الاشعری کی مقالات الاسلامیین اور نوبختی کی فرق الشیعہ کے علاوہ مطبوعات کی ایک لمبی فہرست ہے (۶)۔ تاریخ، تذکرہ، ادب اور دوسرے فنون سے متعلق مخطوطات کی اشاعت کے لیے Bibliotheca Islamica کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ اب تک علم وادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ غرض ان کی علمی اور تحقیقی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن علم و دانش کی دنیا کے لیے ان کا سب سے بڑا تحفہ فوادسزکین تھے جن کو انہوں نے تعلیم دی، تربیت کی، مخطوطات کی دنیا سے روشناس کیا اور تحقیق وتصنیف کی راہ پر لگایا۔

رٹر بہت سخت گیر تھے۔ اسی لیے ان کی زیر نگرانی تعلیم وتربیت کے خواہاں بہت کم طالب علم ہوتے تھے۔ نوجوان فوادسزکین خود بھی سخت کوش اور محنت کے عادی تھے اور اس طرح استاد کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک کن جاں گداز مراحل سے گذرنا پڑا اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دن استاد نے شاگرد سے پوچھا روزانہ کتنا وقت مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ سعادت مند شاگرد نے جواب دیا تیرہ سے چودہ گھنٹہ۔ اس جواب پر خوش ہونے کے بجائے استاد نے کہا اس پر تو تم سائنس داں نہیں بن سکتے۔ شاگرد نے اوقات کار میں اضافہ کیا اور زندگی بھر ۱۸ گھنٹہ کام کرتے رہے۔ البتہ بڑھاپے میں اس میں کسی قدر کمی ہوگئی تھی۔ (۷)

وہ جس ماحول سے آئے تھے وہاں ان کو بتایا گیا تھا کہ دنیا گائے کی سینگ پر ٹکی ہوئی ہے۔ انہیں وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں نے کوئی قابل ذکر کام

www.shibliacademy.org

نہیں کیا(۸)۔ جب ان کو اپنے استاد سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں تو ان کے شوق کو مزید مہمیز ہوئی۔ خوش قسمتی سے استانبول کی لائبریریاں ان علماء اور محققین کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس طرح ان کو مخطوطات سے دلچسپی پیدا ہوئی جو وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ یہی حاصل زندگی بن گئی۔ استاد کے ساتھ ان لائبریریوں کے پھیرے لگاتے ہوئے وہ ان کے سحر کے اسیر ہوتے چلے گئے۔

شاگرد کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے استاد نے کہا کہ اس میدان میں کام کرنے کے لیے عربی سے اعلیٰ درجہ کی واقفیت ضروری ہے۔ ان کو جلد ہی اس کا موقع بھی مل گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جنگ عظیم کے زیر اثر ترکی کے تمام علمی ادارے چھ مہینہ کے لیے بند کر دیے گئے۔ فواد سزکین نے یہ پورا وقت عربی سیکھنے میں صرف کر دیا۔ روزانہ سترہ گھنٹہ کام کیا۔ اس دوران نماز یا بہت ضروری کام سے ہی گھر سے نکلتے تھے۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد استاد نے ان کی عربی دانی کا امتحان لیا تو حیرت زدہ رہ گئے، انہوں نے کہا کہ اتنی کم مدت میں میں نے کسی کو کسی زبان میں اتنی مہارت حاصل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پروفیسر سزکین کا بیان ہے کہ انہوں نے کبھی کسی استاد کو اپنے طالب علم کی کامیابی پر اس طرح خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا جس طرح رڈر اس دن خوش ہوئے۔(۹)

اپنے مجوزہ منصوبہ پر کام کی تیاری کے مقصد سے بعد میں انہوں نے عربی کے علاوہ فارسی، عبرانی، سریانی اور لاطینی زبانیں بھی سیکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو ۲۷ زبانیں معلوم تھیں۔ لیکن ان کا خود یہ کہنا ہے کہ اس میں کسی قدر مبالغہ کا پہلو ہے(۱۰)۔ علوم کی تاریخ پر کام کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے محققین کی تصانیف ان کی اپنی زبان میں پڑھی جائیں۔ رڈر جیسے فاضل استاد کی رہنمائی میں حوصلہ مند شاگرد کے دماغ میں دھیرے دھیرے مستقبل میں کام کا ایک نقشہ بنتا گیا۔ مخطوطات سے جیسے جیسے واقفیت بڑھتی گئی اس منصوبہ کے خط وخال بھی واضح ہوتے چلے گئے۔ ابتدا میں استاد کے ساتھ اور بعد میں خود مخطوطات کی لائبریریوں میں آمد ورفت بڑھتی گئی اور مسلمان علماء کی تحقیقات سے جیسے جیسے واقفیت بڑھتی گئی، اسی مناسبت سے تاریخ علوم میں شیفتگی بھی بڑھتی گئی۔

پروفیسر سزکین پی۔ ایچ۔ ڈی کب کی اور اس کا موضوع کیا تھا اس سلسلہ میں اختلاف رائے ہے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ انہوں نے ”صحیح بخاری کے مصادر“ کے موضوع پر تحقیق کی اور ۱۹۵۴ء

www.shibliacademy.org

میں ان کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی (۱۱)۔لیکن ان کے سوانح نگار پروفیسر عرفان پلماز صراحت سے یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے ابوعبیدہ کی کتاب ''مجاز القرآن'' پر کام کیا۔وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ان کے موضوع تاریخ العلوم سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا پھر اس کو انہوں نے اپنے مقالہ کا موضوع کیوں بنایا۔ان کا خیال یہ ہے کہ ایسا انہوں نے برکت کے لیے کیا ہوگا۔ وہ پروفیسر فواد کی اس موضوع پر ایک طویل گفتگو نقل کرتے ہیں۔اس کے مطابق اس کتاب کا تنہا نسخہ انقرہ میں اسماعیل صائب کی لائبریری میں تھا۔اسماعیل صائب سے رٹر کے مخلصانہ تعلقات تھے۔انہی سے یہ کتاب پروفیسر سزکین کو دستیاب ہوئی۔لیکن ایک ایسی کتاب پر ریسرچ مناسب نہیں معلوم ہوتی تھی جس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہو۔چنانچہ انہوں نے اس کے کسی اور نسخہ کی تلاش شروع کی۔خوش قسمتی سے ان کو اس کا ایک اور نسخہ مل گیا۔جب اس دریافت کی اطلاع اپنے استاد کو دی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے ''فاندھش استاذی کثیراً''۔وہ خود تیس سال سے اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کی تلاش میں تھے لیکن انہیں کامیابی نہیں ملی۔یہی کتاب ان کی تحقیق کا موضوع بن گئی ''اصبح الکتاب الذی عرضہ استاذی ھو موضوع رسالتی للدکتوراہ وانتھیت منہ عام ۱۹۵۱'' (۱۲)۔اس سے واضح ہے کہ انہوں نے اسی موضوع پر ریسرچ کی اور ان کا یہ کام ۱۹۵۱ء میں پورا ہوگیا تھا۔بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بخاری تک ''مجاز القرآن'' ہی کے ذریعہ پہنچے۔بخاری میں جب ان کو معمر بن مثنی کے حوالے نظر آئے تو تحقیق پر پتہ چلا کہ وہ ''مجاز القرآن'' سے ماخوذ تھے۔اس طرح بخاری کے تحریری مصادر کی تحقیق کا خیال آیا۔محسوس ہوتا ہے کہ پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کے بعد انہوں نے بخاری پر کام شروع کیا۔ یہ کام ۱۹۵۴ء میں پورا ہوا۔اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ مستشرقین کا یہ دعوی درست نہیں ہے کہ ابتدائی صدیوں میں حفاظت حدیث کا کوئی قابل اعتماد نظام موجود نہیں تھا اور احادیث کی حفاظت زبانی روایت پر منحصر تھی۔واقعہ یہ ہے کہ بخاری اور حدیث کے دوسرے متداول مجموعوں سے بہت پہلے سے بلکہ ابتدا ہی سے احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔چنانچہ بخاری نے بنیادی طور پر حدیث کے انہی تحریری مجموعوں پر اعتماد کیا ہے (۱۳)۔یہ علم حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔

رٹر ۱۹۲۶ء سے استانبول میں مقیم تھے۔۱۹۴۹ء میں وہ فرینکفرٹ لوٹ گئے اگرچہ بعد میں ۱۹۵۶ء میں وہ واپس آئے اور ۱۹۶۹ء تک وہاں مقیم رہے۔۱۹۴۹ء میں انہوں نے روتے ہوئے

www.shibliacademy.org

پروفیسر سزکین سے کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ اس شہر کی لائبریریاں میری اپنی ملکیت ہیں۔ اب میں یہ تخت تمہارے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ ان کی قیمت پہچانو۔ (۱۴)

۱۹۵۴ء میں سزکین کا تقرر یونیورسٹی میں ہوگیا۔ اسی دوران کارل بروکلمان کی شہرہ آفاق کتاب تاریخ الادب العربی کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں اندازہ ہوا کہ اس کتاب میں استانبول کی لائبریریوں میں محفوظ مخطوطات کا ذکر بہت کم ہے۔ بروکلمان نے برلن کی امپریل لائبریری میں بیٹھ کر اپنا یہ عظیم الشان کام پورا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی اساس کیٹلاگس پر تھی۔ چنانچہ جن لائبریریوں کے کیٹلاگ اس وقت تک تیار نہیں ہوئے تھے زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ وہاں محفوظ مخطوطات کا ذکر اس میں نہیں آسکا ہوگا۔ پروفیسر سزکین کو یہ معلوم تھا کہ صرف استانبول کی لائبریریوں میں تین لاکھ کے قریب مخطوطات موجود ہیں۔ چنانچہ ان کی خواہش ہوئی کہ وہ اس کمی کی تلافی کرکے اس کتاب کی تکمیل کردیں۔ رٹر نے اس کام کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ابتدائی منصوبہ بروکلمان کی کتاب کا تکملہ یا ذیل لکھنے کا تھا (۱۵)۔ اس طرح کے کام کے لیے درکار وسائل ترکی میں دستیاب نہیں تھے۔ اسی دوران ۱۹۶۱ء میں کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ ان کو جرمنی منتقل ہونا پڑا۔ ۱۹۶۰ء میں جب فوج نے عدنان مندریس کی حکومت کو ختم کرکے فوجی حکومت قائم کی تو اس کا اثر تعلیمی اداروں پر بھی پڑا اور بڑی تعداد میں یونیورسٹی کے اساتذہ کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ ان میں پروفیسر سزکین بھی شامل تھے۔ ۱۳/ مارچ ۱۹۶۱ء کو وہ جرمنی کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کو وطن چھوڑنے کا بہت دکھ تھا۔ اس وقت ان کو اندازہ نہیں تھا کہ قدرت کس طرح ان کے عظیم منصوبہ کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کررہی تھی۔ (۱۶)

فرینکفرٹ میں گویٹے یونیورسٹی میں ابتدا میں انہوں نے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ جرمنی میں انہوں نے دوبارہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ موضوع ''عربی اسلامی سائنس کی تاریخ'' تھا۔ وہیں اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر ۱۹۶۵ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں ایک خاتون مستشرق ارسولا سے شادی ہوئی۔ وہ شادی سے پہلے اسلام قبول کرچکی تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ہلال رکھا گیا۔ (۱۷)

پروفیسر سزکین کے جرمنی منتقل ہونے سے پہلے یونیسکو کی سرپرستی میں یوروپ کے بڑے محققین کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی تاکہ اس کی نگرانی میں بروکلمان کے عظیم الشان کام کو نئے انداز میں

www.shibliacademy.org

شائع کیا جائے۔ طباعت کے لیے لائیڈن کے مشہور طباعتی ادارے اے۔ جے۔ برل کو منتخب کیا گیا۔ اس کمیٹی کے کئی اجلاس ہوئے اور بعض میں پروفیسر سزکین کو بھی مدعو کیا گیا۔ انہوں نے اپنا منصوبہ کمیٹی کے سامنے رکھا۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ کوئی آدمی تنہا یہ کام نہیں کرسکتا۔ مشہور مستشرق اور مورخ برنارڈ لیوس کا کہنا تھا کہ کوئی ترک مسلمان یہ کام نہیں کرسکتا۔ جب ۱۹۶۷ء میں تاریخ التراث العربی کی پہلی جلد چھپ گئی تو کمیٹی نے ایک میٹنگ کرکے خاموشی سے اس منصوبہ کو ختم کردیا۔ البتہ یونیسکو نے اس پروجیکٹ کے لیے جو رقم مختص کی تھی وہ پروفیسر سزکین کو دستیاب نہیں ہوئی۔ (۱۸)

جیسا کہ ذکر ہوا ابتدا میں پروفیسر سزکین کا منصوبہ بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کا تکملہ لکھ کر اس کی کمیوں کی تلافی کرنا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اس مسئلہ پر گہرائی سے غور کیا اور اس کے مضمرات کا تجزیہ کیا تو اپنا منصوبہ بدل دیا اور اس کے بجائے ایک بالکل الگ، مستقل اور نیا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب جو مقصد ان کے پیش نظر تھا وہ اس سے پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں ”ولکنی غیرت رائی بعد ان تعمقت فی هذا الحقل .... وقد رایت فی نهایة المطاف ان هذا العمل لا بد ان یکون عملاً جدیدًا مستقلاً و شاملاً“ (۱۹)۔ اس نئے کام میں بھی مخطوطات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن اس کا کینوس اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ یہ تو ضروری تھا کہ اس موضوع پر دنیا بھر میں پائے جانے والے مخطوطات کا ممکن حد تک احاطہ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے غیر معمولی اہتمام کیا اور دنیا کے ہر اس گوشے اور خطے میں گئے جہاں اس جنس گراں مایہ کے ملنے کا کوئی بھی امکان تھا۔ اس راہ میں انہوں نے غیر معمولی جدوجہد کی اور ساٹھ ملکوں کا سفر اس مقصد سے کیا (۲۰)۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انہوں نے جو عظیم الشان کام کیا وہ بروکلمان کا تکملہ یا ذیل نہیں تھا بلکہ یہ مکمل طور پر ایک الگ اور مستقل کام تھا جو یقینی طور پر اس سے کہیں بڑا اور وسیع کام تھا۔ علاوہ ازیں یہ بروکلمان کے عظیم کام کے نمونہ اور نہج پر کوئی بلیو گرافی نہیں تھی۔ امکان کی حد تک دنیا بھر میں پائے جانے والے مخطوطات کے احاطہ کے باوجود یہ بلیو گرافی کے بجائے تاریخ علوم تھی اور اس کا مطمح نظر صرف مخطوطات کی تلاش و جستجو کے نتائج پیش کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے وسیلہ سے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلمان کے غیر معمولی اکتسابات اور خدمات کے تعلق سے سچائی کا اظہار تھا جس کو صدیوں سے نہایت منصوبہ بند طریقے سے چھپایا گیا تھا اور مسلمانوں کو مسلسل ایک علم

www.shibliacademy.org

دشمن قوم کے طور پر پیش کیا جاتا رہا تھا۔ یہ ایک قرض تھا جو صدیوں سے مسلمانوں کے اوپر واجب الادا تھا لیکن مسلمان خود نہیں جانتے تھے کہ ان کا ماضی علم، تحقیق اور اکتشاف و ایجاد کے میدان میں کتنا روشن تھا۔ پروفیسر فواد سزکین نے پوری امت کی طرف سے اس فرض کفایہ کو ادا کر دیا اور اس طرح کر دیا کہ اہل علم کے لیے اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ البتہ ہٹ دھرمی کی بات الگ ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ بروکلمان کے کام میں اور پروفیسر فواد سزکین کے کام میں جو بنیادی اور جوہری فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔

بروکلمان کے کام کی تکمیل بھی ایک مشکل کام تھا۔ یوروپین اسکالرس کی رائے میں یہ کسی ایک آدمی اور خاص طور سے کسی مسلمان کے بس کا نہیں تھا (۲۱)۔ لیکن دوسرا کام اس سے بدرجہا مشکل تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب پروفیسر سزکین نے اپنے ابتدائی منصوبہ یعنی بروکلمان کا تکملہ لکھنے کا ذکر اپنے استاد اور مشہور مستشرق ہلمٹ رٹر سے کیا تو انہوں نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی (۲۲)۔ یورپ کے دوسرے اسکالرس کے برخلاف وہ نوجوان سزکین کی صلاحیتوں اور ان کے کام کے طریقہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ یہ کام پورا کرلیں گے۔ لیکن جب انہوں نے اپنے دوسرے منصوبہ کے بارے میں انہیں بتایا تو انہوں نے اپنے عزیز شاگرد کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی رائے میں یہ کام اتنا وسیع تھا کہ کوئی تنہا آدمی اسے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے ان کی رائے یہ تھی کہ سزکین کو ایک لاحاصل کام کے پیچھے ہلکان نہیں ہونا چاہیے (۲۳)۔ لیکن یہ وہ نشہ نہیں تھا جسے ترشی اتار دیتی۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے استاد کی بات نہیں مانی۔ اپنے کام کے لیے ۴۳۰ھ تک کی مدت متعین کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بروکلمان کے کام کو دیکھ کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی تھی اور ان کے حوصلہ نے جواب دے دیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہی زمانہ مسلمانوں کی علمی ترقی اور عروج کا زمانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اب جو کام ان کے پیش نظر تھا اس کے ابعاد اور جہات کا ان کو اندازہ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسانی صلاحیت اور زندگی کی محدودیت بھی پیش نظر رہی ہوگی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طویل زندگی میں روزانہ ۱۷/اور ۱۸/گھنٹہ کام کرنے کے باوجود وہ اپنا منصوبہ پورا نہ کرسکے۔ لیکن سترہ جلدیں جو وہ لکھ چکے تھے کیا یوروپ میں بھی کوئی ان کی ہمسری کا دعوی کرسکتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب تاریخ التراث الاسلامی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو رٹر نے جس طرح اس کے

www.shibliacademy.org

بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا وہ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ استاد نے اپنے عزیز شاگرد کو لکھا:

''ایسی کتاب نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ اس کے بعد اس حسن کے ساتھ لکھی جا سکے گی''۔ (ان کتابًا کھذا لم یکتب من قبل و لن یکتب بعد ذلک بھذہ الروعۃ)(۲۴)۔ یاد رہے کہ رٹر بروکلمان کے شاگرد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے استاد اور شاگرد دونوں کے کام کی اہمیت اور نوعیت سے پوری طرح واقف تھے۔

پہلی جلد دراصل ایک تجربہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک ایسے علاقہ میں سفر کے مترادف تھا جس کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں تھیں۔ اس سے حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں انہوں نے اپنے طریق کار میں بہت کچھ تبدیلی کی۔ وہ خود کہتے ہیں ''غیرت طریقی فی الکتابۃ بالکامل'' (۲۵)۔ چنانچہ جیسے جیسے ان کا مطالعہ اور تجربہ بڑھتا گیا وہ اپنے طریق کار میں آخر تک تبدیلیاں کرتے رہے۔ وہ دمِ واپسیں تک اس منصوبہ پر کام کرتے رہے۔ انتقال کے وقت وہ اٹھارہویں جلد پر کام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی دوسرے علمی منصوبوں پر بھی کام کر رہے تھے۔ ان تمام امور پر انشاءاللہ کسی قدر تفصیل سے بعد میں گفتگو ہوگی۔

ان کا کام جرمن زبان میں ہے اور ابھی تک اس کا بہت مختصر حصہ ترجمہ ہو سکا ہے۔ اردو میں میری معلومات کی حد تک صرف تاریخ التراث الاسلامی جلد اول کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہو چکا تھا۔ عربی میں اس سلسلہ کی بعض اور جلدوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمے انٹرنیٹ پر پی۔ڈی۔ایف شکل میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ عام کتب خانوں اور محققین کی ذاتی لائبریریوں میں بھی موجود ہیں۔ اس کے باوجود عالم اسلام ان کے کام کی اہمیت اور نوعیت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ برصغیر میں یہ آگاہی اور بھی کم ہے۔

پروفیسر فواد سزکین کو بارگاہ رب العزت سے طویل عمر ملی۔ اس کو انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل میں صرف کیا۔ اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ کئی نہایت اعلیٰ درجہ کے ادارے قائم کیے۔ ان میں فرینکفرٹ یونیورسٹی میں ان کا قائم کیا ہوا معہد تاریخ العلوم العربیہ والاسلامیہ اور اس سے ملحق میوزیم عالمی معیار کے غیر معمولی اہمیت کے ادارے ہیں۔ اپنے میدان کار میں اس معہد کو دنیا

www.shibliacademy.org

میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ انہیں اداروں کے نمونہ پر انہوں نے استانبول میں ایک معہد اور میوزیم قائم کیا۔ میوزیم اور معہد کی تفصیلات بھی انشاءاللہ آیندہ فراہم کی جائیں گی۔ اپنے اختصاص کے موضوع پر عالمی معیار کا ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا اور آخر تک اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہیں فیصل اوارڈ کے علاوہ متعدد اوارڈ تفویض ہوئے۔ آخر میں ترکی منتقل ہو گئے تھے اور جیسا کہ شروع میں ذکر ہو چکا ہے وہیں انتقال کیا۔ آیندہ انشاءاللہ ان کی خدمات کی کسی قدر تفصیل الگ الگ عنوان کے تحت پیش کی جائیں گی۔

(باقی)

مآخذ

(۱) روزنامہ صباح (انگریزی)، استانبول، ۳۰ جون ۲۰۱۸ء۔ (۲) مثال کے طور پر دیکھیے Ferhat Kucuk، روزنامہ صباح، یکم جولائی ۲۰۱۸ء۔ (۳) عرفان یلماز، عربی ترجمہ احمد کمال، مکتشف الکنز المفقود، فواد سزگین۔ جولۃ وثائقیۃ فی اختراعات المسلمین، دار النیل للطباعۃ والنشر، ۲۰۱۵ء، القاہرہ، مصر، ص ۱۴۱ و مابعد۔ (۴) نفس مصدر، ص ۱۷۔ (۵) نفس مصدر، ص ۱۸۔ (۶) نفس مصدر، ص ۱۸ و مابعد۔ مزید دیکھیے نجیب العقیقی، المستشرقون، الجزء الثانی، دار المعارف، مصر، ۱۹۸۰ء، ص ۴۶۰۔ ۴۶۲۔ (۷) مکتشف الکنز المفقود، ص ۲۲۔ (۸) نفس مصدر، ص ۲۱۔ (۹) نفس مصدر، ص ۲۲۔ (۱۰) نفس مصدر، ص ۲۷۔ (۱۱) مثال کے طور پر دیکھیے A. R. Momin, IOS Minaret (on line) www.iosminaret.org۔ مزید دیکھیے، روزنامہ صباح، یکم جولائی، ۲۰۱۸ء۔ (۱۲) مکتشف الکنز المفقود، ص ۲۸۔۲۹۔ (۱۳) نفس مصدر، ص ۲۹۔ (۱۴) نفس مصدر، ص ۳۰۔۳۱۔ (۱۵) نفس مصدر، ص ۲۹۔۳۰۔ (۱۶) نفس مصدر، ص ۳۷۰۔ (۱۷) نفس مصدر، ص ۴۵۔۴۶۔ (۱۸) نفس مصدر، ص ۳۰، ۴۶۔۴۹۔ (۱۹) نفس مصدر، ص ۴۹۔۵۰۔ (۲۰) نفس مصدر، ص ۳۴۔ (۲۱) نفس مصدر، ص ۴۸۔ (۲۲) نفس مصدر، ص ۳۰۔ (۲۳) نفس مصدر، ص ۳۴۔ (۲۴) نفس مصدر، ص ۴۹۔ (۲۵) نفس مصدر، ص ۳۲۔

www.shibliacademy.org

مولانا عبداللہ کاپودروی مرحوم

(۱۹۳۵ء-۲۰۱۸ء)

افسوس ۱۰/ جولائی کو ہندوستان ہی نہیں پوری ملت اسلامیہ کو ایک ایسی شخصیت سے محرومی کا شدت سے احساس ہوا جو اپنے علم، فضل، دردمندی، دل سوزی، اخلاق عالیہ اور سب سے بڑھ کر دین کی خدمت و پاس داری میں نام ونمود سے بے پروا ہوکر مدۃ العمر مصروف عمل رہا، ان کا جانا واقعی ایسے عالم کا رخصت ہونا ہے جو اپنی ہمہ گیر اور ہمہ جہات صفات سے بجائے خود ایک عالَم تھا۔ ان کو گجرات دارالخیرات کا فخر کہا گیا، حقیقت یہ ہے کہ وہ پورے ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے لیے باعث فخر تھے۔ مولانا عبداللہ کاپودروی مدتوں یاد آئیں گے۔

وہ ۱۹۳۵ء میں برما موجودہ میانمار میں پیدا ہوئے۔ گجراتی تھے لیکن برما میں والد ماجد کے کاروبار کی وجہ سے ان کا خاندان وہیں مقیم تھا لیکن جلد ہی وہ گجرات کی ایک بستی کاپودرا میں آ گئے اور آج یہی گمنام سی بستی صرف مولانا کی نسبت سے نیک نام اور زبان زد عوام بن گئی۔

مولانا کی تعلیم ڈابھیل اور پھر دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، جہاں اور بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے خاص تعلق رہا۔ بیعت ہوئے اور اجازت بیعت حاصل کی۔ بعد میں ان کا تعلق ترکیسر گجرات کے دارالعلوم فلاح دارین سے ہوا اور یہ ادارہ گویا آخری سانس تک ان کی جدو جہد اور آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز رہا۔ فلاح دارین کو جاننے والے اس خوبی پر متفق اللسان ہیں کہ مولانا کاپودروی نے اپنے حسن عمل سے اس ادارہ کو رجال کی ٹکسال میں ڈھال دیا۔ ان کی بے شمار خوبیوں میں ''تصنیف رجال'' کا ذکر سب سے کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے وسعت علم نے ان کو فراخی دل کی نعمت عطا کی تھی۔ ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال اور ان کے اشخاص کی قدر وعزت، ان کی خدمات کا اعتراف ایسا دلنشیں اور دلنواز تھا کہ دیکھتے ہی تمنا ہوتی تھی کہ کاش دل ودماغ کی یہ

www.shibliacademy.org

وسعت اور ظرف کی بلندی سب میں عام ہوجائے۔

علم اور کتابوں کا ان کا شوق تو غضب کا تھا۔ دارالمصنّفین وہ کئی بار تشریف لائے اور ہر بار یہاں کی کتابوں کی فرمائش کرتے، فون پر برابر نئی مطبوعات کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے اور فرماتے کہ جلد سے جلد ان کو کتاب بھیجی جائیں۔ شبلی وسلیمان کے ذکر میں ہم نے ان کو اشک بار دیکھا۔ انتقال سے پہلے وہ شاید امریکا یا کناڈا میں تھے۔ ان کو معارف کے شذرات کے انتخاب کے مجموعہ کا علم ہوا جو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے تھا۔ بڑی بے تابی سے فون پر اس کے بارے میں گفتگو فرمائی اور حکم دیا کہ یہ نمبر ان کو فوراً بھیج دیے جائیں۔ یہ سب محض اس لیے تھا کہ ان کی فطرت اور سرشت ہی علم پرور اور علم نواز ودیعت ہوئی۔

طبقۂ علماء میں یہ کہنا شاید ہمارے لیے جسارت کی بات ہو لیکن ہے یہی بات کہ ایسا انکسار، ایسا تواضع، ایسی محبت، ایسی شفقت، کم دیکھنے میں آتی ہے، خصوصاً ان کے لیے جو ان کے معیار پر اترتے نہیں نظر آتے تھے۔

زندگی کا بیشتر حصہ تدریس یا تنظیم میں گزرا لیکن ان کے قلم کو بھی ان سے شکایت نہیں۔ اگر رہی بھی ہوگی تو شاید یہی کہ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم، ان کی عربی اور اردو کئی کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے گجرات کی علمی تاریخ پر اضواء علی تاریخ الحرکۃ العلمیہ عربی میں اور اردو میں علامہ قطب الدین نہروالی، علامہ یوسف بنوری وغیرہ۔ ترجمے بھی ہیں جیسے علامہ بدرالدین عینی اور دیوان امام شافعی۔ ان کی ایک کتاب صدائے دل، کئی جلدوں میں ہے۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے تیسرا حصہ مرحمت فرمایا، ٹائٹل پر یہ شعر درج کیا کہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

کتاب صدائے دل بھی ہے اور دوائے دل بھی۔ ان کی زندگی، مقصد اور جذبہ وروح کی تمام تجلیاں اور بجلیاں جیسے اس میں سمٹ آئی ہوں۔ زیادہ تر توجہ علمائے کرام کی جانب ہے۔ یہ کتاب ہر شخص کے مطالعہ کی چیز ہے۔ دین سے دنیا کے رشتے کو انہوں نے جس طرح سمجھایا، اسے خاص طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور دارالعلوم

www.shibliacademy.org

فلاح دارین بلکہ پورے طبقہ علماء میں ان کی کمی کو بطریق احسن پورا فرمائے۔ آمین

مولانا عبداللہ کاپودروی مرحوم پر یہ تعزیتی تحریر گذشتہ شمارہ میں آنی چاہیے تھی لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے تاخیر ہوئی، ساتھ ہی اردو ادب خصوصاً بلند ترین طنز و مزاح کے باب میں اپنا منفرد مقام بنانے والے اور خود اردو طنز و مزاح کو نئی بلندیوں تک پہنچانے والے جناب مشتاق احمد یوسفی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوسفی صاحب کو پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کی یاد دلانے والے ہی نہیں خود ایک دبستان بن جانے والے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں کہ خود نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے ان کو طنز و مزاح کے جیتے جاگتے معجزے سے یاد کیا ہے۔ وہ اس مزاح کے قائل تھے جو دوسروں کو مسکرانے کے ساتھ کچھ سوچنے پر اکساتا ہے۔ تفکر اور تفنن کو یکجا دیکھنے ہی کی نہیں انہوں نے کامیابی سے ان کو برتنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ہر چیز میں حل ہو جاتی ہیں۔ مذہب، الکحل اور مزاح۔ یوسفی صاحب ٹونک کے تھے اور ٹونک اپنی مذہبی، علمی، تحقیقی اور شعری امتیازات کے لیے مشہور ہے۔ یہ ساری روایات ان کو وطنی ورثہ میں ملیں۔

اسی طرح ہم سے ڈاکٹر نورالسعید اختر بھی رخصت ہو گئے۔ وہ دارالمصنّفین اور معارف کے عاشق تھے۔ ان کے کئی مضامین معارف میں شائع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

مشہور صحافی کلدیپ نیر بھی ایک طویل زندگی کا سفر طے کر کے دوسری دنیا کے راہی بن گئے۔ صحافت میں ان کا درجہ اور مسائل پر ان کی گہری نظر کے سب معترف تھے۔ صحافت انہوں نے اردو زبان سے شروع کی اور یہ رشتہ ان کا آخر تک قائم رہا۔ ان کے جانے سے صرف اردو ہی نہیں پوری صحافتی دنیا کو بڑے نقصان اور کمی کا احساس ہے، خصوصاً موجودہ بے لگام صحافت کے دور میں ان کا خلا عرصہ تک محسوس کیا جائے گا۔

معارف ان سب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر پر کاش ممبئی کا کوئی صاحب قلم کچھ اور تفصیل سے روشنی ڈال سکے۔

ع۔ص

www.shibliacademy.org

ادبیات

غزل

پروفیسر سید امتیاز احمد ماہر علیگ

(علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زمین پر جو انہوں نے حضرت تھانویؒ کے انتقال پر حسب ذیل مطلع کے ساتھ کہی تھی)

داغ فراق یار مٹایا نہ جائے گا اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اب راز ہائے عشق چھپایا نہ جائے گا
مجھ سے یہ راہ و رسم نبھایا نہ جائے گا
سر سے اتار دوں گا نہ جانے کہاں اسے
بار گران زیست اٹھایا نہ جائے گا
دامن گل مراد سے بھرلو کہ وقت ہے
دوبارہ پھر یہ باغ لگایا نہ جائے گا
میداں میں ہوگی عقل برابر گریز پا
جب تک جنون عشق کو لایا نہ جائے گا
کھاتے رہیں گے زخم یہ مرہم کے واسطے
دست سوال ہم سے بڑھایا نہ جائے گا
اندوہ یاس و غم سے ہیں الفاظ مضمحل
حال شب فراق سنایا نہ جائے گا
دیکھو وہ بے نقاب سر بزم آگئے
محفل میں اب چراغ جلایا نہ جائے گا
دنیا تلاش حق کے لیے پھر چلی ہے آج
فطرت کی اس خلش کو دبایا نہ جائے گا
انداز مصلحت بھی ضروری ہے دوستو
دل میں جو ہے زبان پہ لایا نہ جائے گا
ماہرؔ ملیں وہ راہ میں ممکن نہیں ہے یہ
اور مجھ سے ان کی بزم میں جایا نہ جائے گا

بارہ دری بہار شریف، سابق پروفیسر علامہ اقبال کالج، بہار شریف۔

www.shibliacademy.org

غزل

جناب جمیل مانوی

تری نظر کا اجالا ہے پاسبان مرا
اسی چراغ سے روشن ہوا جہان مرا

زمیں اسی کے کرم سے مرے تصرف میں
اسی کے نور سے روشن ہے آسمان مرا

مرے ارادوں کی تعبیر یہ رکوع و سجود
ترے ارادوں کی تعبیر ہے جہان مرا

وہ سکھ جزائے عمل تھے کہ رحمتیں تیری
یہ دکھ سزائے عمل ہے کہ امتحان مرا

سمجھ سکوں گا کہ بے چہرہ بت نہیں ہے کوئی
ترے وجود کو چھولے اگر گمان مرا

زمانہ ہے مرے فکر و عمل کا آئینہ
میں ترجمان ہوں اس کا یہ ترجمان مرا

جو ہاتھ بڑھ کے ستاروں کو چھونا چاہتے ہیں
قدم قدم پہ ملے گا انہیں نشان مرا

یہ سانحہ مری تاریخ کی امانت ہے
مرے قبیلہ کا قاتل ہے پاسبان مرا

بھٹک رہا ہوں انہیں راستوں پہ تیرے بغیر
جہاں لُٹا ترے ہوتے ہوئے جہان مرا

جمیلؔ اپنے پرائے کا امتیاز نہیں
کریم بھی ہے سخی بھی ہے میزبان مرا

سہارن پور۔

www.shibliacademy.org

مطبوعات جدیدہ

شعر اساس تنقید: از جناب عطا عابدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۵۰ روپے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۶، پتے: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، حیدرآباد ممبئی، پٹنہ، کلکتہ، لکھنؤ اور الہ آباد کے مشہور مکتبے۔

قریب ۶۰-۶۵ موضوعات پر چھوٹی چھوٹی لیکن بڑے کام کی ایسی تحریریں جن میں مطالعہ، تجزیہ اور تنقید کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اس کتاب کو افادیت عطا کرتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ چند شعراء مثلاً فیض، حسن نعیم وغیرہ کے سوا باقی تمام شاعر اور ان کی کاوشیں زیر بحث ہیں جو نسبتاً کم معروف یا کسی خاص حلقہ میں ہی مقبولیت وشہرت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنف کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ شاعر کی قدرشناسی یا تحسین کا عمل بڑے اور مشہور ناموں یا کسی محدود تنقیدی نظریہ کا پابند نہیں، ان کی اس رائے میں بھی کچھ اصابت اور صلابت ہے کہ خود کو تنقید کی اونچی کرسی پر سمجھنا اور دوسروں کی تخلیق یا رائے کو حقیر وکم تر سمجھنا کسی جرم سے کم نہیں۔ یعنی یہ کتاب تنقید کے موجودہ برسر اقتدار رجحانوں کے خلاف ایک اظہار برأت بھی ہے اور نئی ادبی نسل کی سوچ کا ایک پُرخلوص اور پُراعتماد اعلانیہ بھی ہے۔ صالح، نافع اور ایمان دار ادب کے عرفان میں اس کتاب کا مطالعہ مفید بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

سائبان رحمتؐ: از جناب ساگر ترپاٹھی، متوسط تقطیع، اعلیٰ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت (صواب دید پر منحصر) یعنی اس کتاب کی آمدنی غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے وقف ہے، پتہ: ساگر ترپاٹھی ۲۵/۱، پشپاوہار، قلابہ، ممبئی۔

نبی رحمتؐ کی حیات طیبہ، شمائل وخصائل حسنہ، بلند ترین اخلاق وآداب کی مدح وثنا کرنے والے بے شمار ہیں۔ ان میں ماننے والے ہیں اور وہ بھی جو بظاہر ان کی امت میں نہیں لیکن ان کی زبان ودل ان کی محبت سے سرشار ہیں۔ زیر نظر مجموعہ نعت بھی ایسے ہی شاعر کے جذبات واحساسات کی دنیا لیے ہوئے ہے، یہ دنیا کم از کم آج کے حالات میں ناقابل یقین سی نظر آتی ہے۔

جب بھی کبھی میں سوچوں، انؐ کے بارے میں — آہٹ انؐ کے قدموں کی سنائی دے اللہ
گر نہیں حکم مجھ کو روضے کی زیارت کا — تو خاک رہ طیبہ ہونے کا ہنر لکھ دے
اے مری جستجو کچھ بتا تو سہی — اور کب تک رہوں گمرہی کا سفر

یہ تو چند اشعار ہیں، پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس مجموعہ نعت کا ہر شعر، نبی کریمؐ کی بے پناہ محبت اور والہانہ عقیدت کا شاہکار ہے، شاید ہی ایسے نعتیہ مجموعے ہوں جن میں ایک شعر بھی بھرتی کا نہ ہو، عقیدت کا یہ اظہار بھی خوب ہے کہ مجموعہ بہترین کاغذ، تزئین اور طباعت سے آراستہ ہے، شروع میں جناب ساگر کے استاد اور رفقاء واحباب کی تحریریں ہیں اور سب کی یہی دعا ہے کہ سائبان رحمتؐ کو قبولیت حاصل ہو اور ساگر ترپاٹھی کو سائبان رحمتؐ۔ ہم بھی اس دعا میں شریک ہیں۔

ع-ص

www.shibliacademy.org

رسید کتب موصولہ

اسلام میں مذہبی رواداری: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلی شرز، D-307، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ قیمت: ۱۲۰/روپے

ایڈوانس اسٹڈیز ان دی ہسٹری آف میڈیول گجرات: ایم، ایس کومس سریت Commissariat، مرتبہ پروفیسر محی الدین بامبے والا، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد۔ قیمت: ۴۵۰/روپے

تتمہ فتحیہ عبریہ: شہاب الدین طالش، مترجم ڈاکٹر عطا خورشید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

حدیقۂ عشرت: کنور درگا پرشاد مہر، تصحیح وتدوین احمد نوید یاسر ازلان حیدر، مرکز تحقیقات فارسی A4، خیابان شبلی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ۔ قیمت: ۲۱۲/روپے

خصائل نبویؐ: مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، تحقیق وتعلیق مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

دلت کو یتا جاگ اٹھی: ڈاکٹر حنیف ترین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ قیمت: ۱۵۰/روپے

رجب طیب اردوغان: ڈاکٹر راغب السرجانی، تعلیق وترجمہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز D-307، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ قیمت: ۲۵۰/روپے

کارنامۂ عشق: آنند رام مخلص، تصحیح وتدوین محمد توصیف خان کاکر، مرکز تحقیقات فارسی A4، خیابان شبلی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۵/روپے

مائکرو اسٹڈیز ان دی کلچرل اینڈ پولیٹکل ہسٹری آف میڈیول گجرات: پروفیسر اکبر علی ترمذی، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد۔ قیمت: ۴۵۰/روپے

نکتہ ہائے فاروقی (نثار احمد فاروقی کے مضامین): سرور الہدی، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ قیمت: ۲۹۳/روپے

www.shibliacademy.org

www.shibliacademy.org

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الفاروق	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الغزالی	200/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
المامون	175/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	80/-
شعرالعجم اول	300/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
شعرالعجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
شعرالعجم سوم	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	90/-
شعرالعجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
شعرالعجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	110/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
		انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
الکلام	250/-	مکاتیب شبلی اول //	150/-
علم الکلام	200/-	مکاتیب شبلی دوم //	190/-
		اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

www.shibliacademy.org

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
September 2018 Vol - 202 (3)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

شبلی صدی مطبوعات

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔ شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔ دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔ شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔ شذرات سرسید	پروفیسر اصغر عباس	500/-
۶۔ محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔ حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔ حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔ شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔ متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔ یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔ رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔ اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔ تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔ مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔ مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۹۔ الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۲۰۔ الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-